حکمتِ رُوحانیاں

حضرت مولانا ڈاکٹر **غلام محمد** قدس سرہٗ العزیز

خلیفہ مجاز حضرت علامہ سید سلیمان ندوی قدس سرہٗ العزیز
مصنف تذکرہ سلیمان، حیات اشرف، حیاتِ بہادریار جنگ

ترتیب و تدوین:
محمد طارق صدیق

پورب اکادمی

حکمتِ رُوحانیاں

مولانا ڈاکٹر غلام محمد قدس سرّہٗ العزیز

ترتیب و تدوین
محمد طارق صدیق

پورب اکادمی، اسلام آباد

فہرست

مضامینِ شیخ

برادر گرامی رائے منیر احمد صاحب نے ہمارے محبوب شیخ حضرت مولانا ڈاکٹر غلام محمد صاحب قدس اللہ سرّہٗ العزیز کے احوال حیات قلمبند کر دیے ہیں۔ ان کا مضمون شامل اشاعت کیا جارہا ہے۔ اپنے مضمون کے دوسرے حصے میں رائے صاحب نے حضرت اقدس کی تصنیفات کا تعارف پیش کیا ہے۔ حضرت والا کا تحریری سرمایہ صرف تصانیف اور تدوینیات میں محدود و منحصر نہیں بلکہ آپ نے کثیر تعداد میں مضامین بھی لکھے ہیں۔ ان مضامین کو یکجا کر کے کتابی شکل میں شائع کرنے کا داعیہ حق تعالیٰ نے رفیق مکرّم پروفیسر طارق صدیق صاحب کے قلب میں پیدا فرمایا ہے۔ موصوف نے اس عاجز سے اپنی خواہش قلبی کا اظہار کیا ہے کہ احقر، حضرت والاؒ کے اس مجموعہ کے بارے میں تعارفی سطور لکھے۔

حضرت والاؒ کی مضمون نویسی کا آغاز عین عالم شباب ہی میں ہو گیا تھا جس کا سلسلہ آخر عمر تک جاری رہا۔ آپ کے نظامِ فکر و عمل میں تعصب، تنگ نظری اور گروہیت کی ذرہ برابر آمیزش نہ تھی۔ اشاعت دین کے لیے کی جانی والی مساعی میں آپ محبت و اخلاص سے شریک ہو جاتے، اسی لیے آپ کے مضامین مختلف دینی اور علمی حلقوں میں یکساں قدر و منزلت کی نگاہ سے پڑھے جاتے رہے اور برصغیر کے مستند اور مؤقر دینی و علمی، تحقیقی رسائل و جرائد میں اشاعت پذیر ہوتے رہے۔ ان میں سے چند ایک کے نام پیش خدمت ہیں:

جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن کا مجلہ طلیلسائین، ماہنامہ عطارد، ماہنامہ ہندوستانی ادب، پندرہ

روزہ پیام صحت، ماہنامہ دارالعلوم دیوبند، ماہنامہ صبح صادق لکھنؤ، ماہنامہ پیغام حق، بزم اقبال لاہور، ماہنامہ البلاغ کراچی، ماہنامہ الحق اکوڑہ خٹک، اقبال ریویو کراچی، حکمت قرآن لاہوروغیرہ قابل ذکر ہیں۔

حضرت والاؒ کی علمی اور فکری دلچسپیاں کس قدر وسیع اور متنوع تھیں اس کا اندازہ آپ کے تحریر کردہ مضامین کے عنوانات کی فہرست پر ایک نگاہ ڈالنے سے ہو جاتا ہے۔ چند ایک عنوانات درج کیے جاتے ہیں:

۱۔ خطاب بر نوجوانان حیدرآباد
(ڈاکٹر رابندرناتھ ٹیگور کے انگریزی خطبہ کا ترجمہ)

۲۔ منزلِ عشق

۳۔ حقیقت دعا

۴۔ قائد ملت (بہادر یار جنگ) کی یاد

۵۔ کلام اقبال کا تحقیقی مطالعہ

۶۔ ملوکیت

۷۔ خاتم النبیین ﷺ کی سیرت کا سیاسی پہلو

۸۔ اسلام اور ملاّ ازم

۹۔ معارف سلیمانیہ (قرآنی نکات)

۱۰۔ سید سلیمان ندویؒ سے پہلی ملاقات

۱۱۔ آنحضرت ﷺ کے بعد کسی کا نبی ہونا محالِ عقلی ہے

۱۲۔ ہمارے ملک میں اشتراکیت اور سرمایہ داریت کی کشمکش

۱۳۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور تصوف

۱۴۔ آہ! شیخ الشیوخ العباسی مدنی قدس سرہ

۱۵۔ حضرت مولانا ابوالحسنات سید عبداللہ حیدرآبادی قدس سرہ

۱۶۔ تعلیم بالغاں اور اسلام

حضرت والاؒ نے فرائض نبوی میں سے ''تزکیہ نفس اور تصفیہ قلب کو چوٹی کا کام سمجھا اور اس فنِ شریف کی علمی اور عملی خدمت میں اپنی ساری زندگی صرف فرمادی۔ اسی بنا پر اس موضوع پر تحریر فرمودہ مضامین کو اوّلیت دیتے ہوئے ''حکمت روحانیاں'' کے نام سے شائع کیا جارہا ہے۔ الحمد للہ اکثر و بیشتر دیگر مضامین بھی محفوظ ہیں، جنہیں بعد ازاں شائع کیا جائے گا۔

راقم آثم کو اپنے شیخ عالی مقام کے جمعۃ المبارک کے خطبات اور دیگر بیانات سننے کا ایک طویل عرصہ تک موقع ملتا رہا۔ فالحمد للہ ۔ حضرت والاؒ بہت تھوڑے وقت میں بہت زیادہ بات کہہ جاتے تھے آپ کی تقاریر زوائد سے بالکل پاک ہوتی تھیں۔ یہی صفت آپ کی تحریروں میں بھی بدرجہ اتم موجود ہے۔ اللہ کریم سے درخواست ہے کہ ہمارے حضرت والاؒ کا فیضانِ معنوی، جو ان تحریروں میں موجود ہے، عام کرے اور برادرم طارق صدیق کی اس کوشش پر انہیں جزائے خیر دیں۔ (آمین)
فصل اللہ علی النبی الامی الکریم وسلم تسلیماً کثیرا۔

ظفر صادق عفی عنہ

حضرت مولانا ڈاکٹر غلام محمد قدس سرّہٗ

(تعارف)

جنابِ حق تعالیٰ نے انسان کی تخلیق فرمائی، معرفتِ ذاتِ حق کی پیاس اُس کے باطن میں رکھی اور پھر اپنی جودوسخا اور رحمت کا اظہار انبیاءِ کرام کو مبعوث فرما کر کیا کہ انسان کو ایک کامل رہنما میسر آئے اور وہ اپنے مقصدِ تخلیق کو حاصل کر سکے۔ اس لئے جنابِ حق تعالیٰ نے قرآنِ کریم میں فرمایا کُلُّ قومٍ ھاد کہ ہم نے ہر قوم، ہر ملت، ہر انسانی گروہ میں ایک ہدایت رساں مبعوث فرمایا یعنی انسان کی باطنی تڑپ اور پیاس کہ وہ خدایاب ہو جائے کے پورا کئے جا سکنے کا سامان بہم پہنچایا۔ انبیاءِ کرامؑ تشریف لاتے رہے اور ہدایت رسانی فرماتے رہے۔ جنابِ افضل الخلائق ﷺ کو خاتم الانبیاء بنا کر بھیجا اور قیامت تک کے انسانوں کی ہدایت رسانی آپ ﷺ کے ظاہری و باطنی اداؤں یعنی سنتِ مطہرہ میں محدود و محصور فرما دی گئی۔ جنابِ حق تعالیٰ نے امتِ محمدیہ کو یہ شرف بھی بخشا کہ ہدایت رسانی کا عظیم مقصد یعنی کارِ نبوت علماءِ ربانی کے سپرد ٹھہرا۔ حدیثِ مبارکہ ہے کہ:

علماء امتی کالانبیاء بنی اسرائیل ہر عہد اور ہر زمانہ ایسے امتیوں کا گواہ رہا ہے اور آئندہ بھی رہے گا کہ جن کا وجود اسوۂ رسول میں زندہ تھا اور زندہ ہو گا۔ اور پھر جس انسان نے بھی ہدایت یابی کے لئے اُن ہستیوں سے تعلق رکھا وہ فلاح پا گئے۔ یہ بات سلسلہ در سلسلہ جاری ہے اور جاری رہے گی۔ حضرتِ اقدس جناب مولانا غلام محمد قدس سرہٗ العزیز بھی اُسی سلسلے کی ایک کڑی ہیں کہ جس نے مضبوطی سے تھام لیا وہ منزل یاب ہو گیا۔

حضرتِ اقدس مولانا غلام محمد رحمۃ اللہ علیہ ۸ ربیع الثانی ۱۳۴۰ھ (9 دسمبر

1921) بروز جمعۃ المبارک حیدر آباد دکن کے ایک ایسے گھرانے میں پیدا ہوئے کہ جس گھرانے کے افراد دینِ محمدی کی روایات کے پاسدار اور جن کی زندگیوں کا مرکز و محور فااتبعونی کا اُصولِ محکم تھا۔ آپؒ کے والدِ گرامی جناب غلام نبی بسیط علیہ الرحمۃ نقشبندیہ مجددیہ سلسلے کے بزرگ محدثِ جلیل حضرت ابو الحسنات سیّد عبدُاللہ شاہ اعلیٰ اللہ مقامہٗ (صاحبِ زُجاجۃ المصابیح) کے مُرید رشید تھے۔ آپؒ کے والدِ گرامی نے ہی آپؒ کا نام غلام محمد رکھا۔ آپؒ کے جدّ امجد حضرت شمس الدین علیہ الرحمۃ سلسلۂ قادریہ کے بزرگ حضرت لعل میاں شاہ رحمۃ اللہ علیہ کے مُرید تھے اور دین کا محکم علمی و عملی ذوق رکھتے تھے اور آپؒ کے عمِ محترم حضرت غلام جیلانی محیط رحمۃ اللہ علیہ حضرت ابوالحسنات سید عبداللہ شاہ رحمۃ اللہ علیہ کے مریدِ با صفا اور خرقہ یافتہ تھے۔ حضرتِ اقدسؒ نے آنکھ ایک ایسی فضا میں کھولی کہ جو ذوقِ عرفانِ حق سے معمور و معطر تھی اور جہاں اللہ کریم اور رسولِ کریم ﷺ کا ہو جانے اور ہو کر اُنہی کا رہے جانے ہی کی روشنی تھی۔ حضرتِ اقدسؒ کی تربیت فرمانے والے بزرگان کے قلوب کی توجہ اور اِن سب سے پہلے جنابِ حق تعالیٰ کی رحمت و محبت کہ پھر زمانے نے دیکھا کہ جنابِ حق تعالیٰ نے آپؒ کو اسم با مسمّٰی بنا دیا۔

وَاللّٰہُ یختصّ برحمتہ من یّشاء وَاللّٰہُ ذُوالفَضلِ العَظِیم

ابتدائی دینی تعلیم آپؒ نے اپنے گھر ہی کے بزرگوں سے حاصل کی جبکہ مروجہ علومِ اسلامیہ کی تحصیل مولانا صابر حیدر آبادیؒ اور مولانا سیّد مقصود علی خیر آبادیؒ سے کی۔ دینی علوم میں گیرائی اور گہرائی جناب مولانا مناظر احسن گیلانیؒ کی تعلیم و تربیت کی مرہونِ منت ہے جو ظاہری اور باطنی علوم کے جامع تھے۔ آغازِ شباب تک حضرتِ والا تبارؒ بنیادی دینی و اسلامی علوم اپنے اساتذہ کرام سے حاصل کر چکے تھے۔ حضرتِ اقدس نے ۱۹۳۹ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا اور ۱۹۴۳ء میں برصغیر کی ایک عظیم درسگاہ جامعۂ عثمانیہ حیدرآباد دکن سے معاشیات اور سیاسیات کے مضامین کے ساتھ گریجویشن کی۔ جامعۂ عثمانیہ ہی سے ۱۹۴۶ء میں ایم۔ڈی (ہومیو پیتھی) کی ڈگری حاصل کی اور اسی دوران ایل۔ایل۔بی کے سالِ اول کا امتحان پاس کیا لیکن وکالت سے عدم مناسبت کی بِنا پر اسے جاری نہ رکھا۔ ایک

سال محکمہ اوقاف میں تربیت حاصل کی لیکن جب آپؒ کو مہتمم اوقاف کا عہدہ سنبھالنے کی پیشکش کی گئی تو کچھ قباحتوں کے سبب آپ نے یہ عہدہ قبول نہ فرمایا۔

حضرت مولانا مناظر احسن گیلانیؒ سے مستقل ربط و ضبط، حضرت سید عبداللہ شاہ حیدرآبادیؒ کے آستانۂ جلیلیہ پر نیازمندانہ حاضری اور نواب بہادر یار جنگؒ کے درِ دولت پر منعقد ہونے والی مجالسِ تفہیمِ اقبال میں شرکت ایک اپنا رنگ اور اثر مرتب تو کر گئیں لیکن باطن ابھی ایسے مردِ حر کے انتظار میں تھا کہ جن کی نگاہ انقلابِ باطن برپا کر دے۔ خود حضرتِ اقدس تحریر فرماتے ہیں کہ

> آغازِ شباب میں مذہب گریزی کا رجحان ترقی پذیر تھا
> اور بزرگانِ دین کی وقعت و عظمت بھی دل میں بس
> یوں ہی سی تھی۔

چنانچہ حضرت الشیخ علامہ سید سلیمان ندوی اعلیٰ اللہ مقامہٗ کی خدمتِ عالیہ میں جب پہلی بار حاضر ہوئے تو اُنؒ کے ایک سوال کے جواب میں اپنا مطمحِ نظر کچھ ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں کہ "ڈگری کے حصول کا مقصد کوئی اچھا عہدہ حاصل کرنا ہے"۔ اُنہی مجلس میں حضور سید صاحبؒ نے اُخروی زندگی کی طرف بے رغبتی کے نتائج کی طرف اشارہ فرمایا تو آپؒ نے ایک طالب علمانہ شوخی اور بیباکی کے ساتھ یہ فرمایا کہ

> یہ سب بجا، اور کبھی کبھی دل بھی چاہتا ہے کہ اُس دنیا کی فکر کی
> جائے مگر جب 'بنجارہ ہل' (شہر حیدر آباد کا مغرب زدہ امراء کا
> محلّہ جو پہاڑی سلسلہ پر واقع ہے) کی طرف جانا ہوتا ہے تو جی
> چاہتا ہے کہ ایسا ہی عالی شان بنگلہ ہو، یہی کرّ وفر ہو اور ایسی ہی
> مہوشیں ہوں!

گویا آپؒ ابھی اپنی باطنی اور روحانی استعدادوں سے بے خبر تھے یعنی شخصیت کے ذہنی اور خِلقی رجحانات کی عمل آرائی تاحال کسی چشمِ ساقی کی منتظر تھی۔ اور جب ایک صاحبِ قلب ونظر کی توجہات آپؒ کی طرف مبذول ہوئیں تو حضرتِ اقدس و اعظم علامہ سید سلیمان

ندویؒ کے ساتھ پہلی نشست کے برخاست ہونے تک آپؒ پورے کے پورے مسخر ہو چکے تھے اور دل و دماغ سے اپنے خالق و مالک کا ہو جانے اور ہو کر رہے جانے کے سوا اور سب کچھ محو ہو چکا تھا۔

سبق ایسا پڑھا دیا اُس نے
دل سے سب کچھ بھلا دیا اُس نے

جنابِ الحکیم و الحاکم نے انقلابِ باطن کا جو وقت مقرر کیا اور جن کے دستِ اقدس سے فیض آپؒ کو حاصل ہونا تھا وہاں پہنچا دیے گئے۔ اب دیر ہی کیا تھی! مردِ کامل کی نظر اور آپؒ کا سالکِ صادق ہونا چنانچہ راہِ سلوک پر چل دیئے اور مقاماتِ سلوک طے ہوتے گئے۔ دنیاوی جاہ و حشمت کی تمنائیں سیلِ معرفت کے سامنے ریت کی دیوار ثابت ہوئیں۔ سلوکِ نبوی کا مزاج جو گھر سے ہی آپ کے وجود کا حصہ تھا، شیخِ عالی مقام حضرت سید سلیمان ندویؒ کی معیت سے اس میں مزید رسوخ پیدا ہوا۔ تمام عمر اپنے ظاہر و باطن کو جنابِ رسولِ کریم ﷺ کی ظاہری و باطنی اداؤں کے رنگ میں رنگنے کی جدوجہد میں رہے اور انجذابِ رنگِ رسول بطرزِ صحابہ کا ہی درس آپ نے اپنے متوسلین کو دیا۔ آپؒ کے ایک خلیفۂ مُجاز جناب عبدالقیوم صبا رحمۃ اللہ علیہ اپنے شیخِ عالی مقامؒ کا ایک فقرہ اپنے متوسلین کو quote کرتے کہ "ہمارے پاس تو بس قرآن و حدیث ہی ہیں"۔ اپنے شیخِ عالی مقام میں فنائیت ایسی تھی کہ اُنؒ کے خلیفہ و جانشین مانے گئے اور سلوکِ نبوی میں ایسا رسوخ تھا کہ جن بھی شیوخ حضرات سے ملاقات ہوئی انہوں نے حددرجہ محبت ہی نہیں بلکہ اکرام سے نوازا۔ سلسلۂ عالیہ چشتیہ اشرفیہ کے اکابر مشائخ، حضرتِ اقدس جناب عبد الباری ندوی علیہ الرحمۃ اور حضرتِ اقدس جناب مولا فقیر محمد علیہ الرحمۃ، سلسلۂ عیدروسیہ (بلادِ مغرب میں اس سلسلہ سے فیض جاری ہے) کے شیخ حضرتِ اقدس سید عمر بن عبداللہ علیہ الرحمۃ (زنجبار، افریقہ) اور سلسلۂ نقشبندیہ کے شیخ حضرتِ اقدس فضل اللہ جیلانی علیہ الرحمۃ سے سندِ خلافت پائی۔ تین سلاسل (چشتیہ، نقشبندیہ، عیدروسیہ) کے فیوض کا سنگم آپؒ کی ذاتِ اقدس تھی اور آپؒ کی ذاتِ باجود سے فیض کے کئی چشمے رواں ہوئے جو کہ آج بھی جاری و

ساری ہیں۔ اللہ ربّ العزت آگے بھی جاری و ساری رکھیں! آمین۔

ہمعصر اکابرین سے ربط و ضبط

حضرتِ اقدس علیہ الرحمۃ کی اپنے وقت کی عظیم علمی و روحانی اکابرین کے ساتھ رازونیاز کے تعلقات رہے، اور اُن شخصیات کی محبت و معیت ہمیشہ آپ کے شاملِ حال رہی۔ حضرتِ اقدسؒ نے اپنی سلامتِ فہم اور استحکام علمی اور جلائے قلبی سے اُن کے قلوب میں گھر کرلیا اور اُن برگزیدہ اولیاء کی توجہاتِ باطنی آپ کو حاصل ہوئیں جو کہ کسی بھی سالکِ سلوک کو منزل یافت بنا دیتی ہیں۔ حضرت ابوالحسنات سید عبداللہ شاہ علیہ الرحمۃ کی رہنمائی میں حضرتِ اقدسؒ نے بلاقیدِ بیعت نقشبندی سلوک یعنی لطائفِ ستہ کا درس پایا اور حضور سید ابوالحسناتؒ ہی سے گلستانِ سعدی اور بوستانِ سعدی پڑھی۔ بنیاد ہی جب ایک شیخِ جلیل کے ہاتھوں رکھی گئی ہو تو مستقبل کا اندازہ اسی سے لگایا جا سکتا ہے۔ اور فنِ تقویٰ و احسان سے آشنائی اور اس کا ذائقہ تو بچپن میں حضرتِ اقدسؒ کے باطن نے حاصل کرلیا تھا۔ عین عنفوانِ شباب میں جب حضرتِ اقدس جامعہ عثمانیہ میں تعلیم حاصل کر رہے تھے تو وہاں حضرت مناظر احسن گیلانی علیہ الرحمۃ سے شاگردانہ رشتہ استوار ہوا۔ حضرت گیلانیؒ دارالعلوم دیوبند سے فارغ التحصیل اور حضرت شیخ الہند علیہ الرحمۃ کے دست گرفتہ تھے لیکن تکمیلِ سلوک حضرت مولانا محمد حسین چشتی حیدرآبادی علیہ الرحمۃ کے حلقۂ توجہ میں آکر حاصل ہوئی، اس لئے آپؒ کی ذاتِ اقدس علومِ ظاہری اور علومِ باطنی دونوں کی جامع تھی۔ حضرت گیلانیؒ کی شیخِ اکبر علیہ الرحمۃ اور حضرت مولانا روم علیہ الرحمۃ سے جو عقیدت تھی وہ روشن اور مسلم ہے۔ اور حضرت مولانا گیلانیؒ کے مزاج اور مشرب کا پرتو اُن کے شاگرد میں بھی تو آنا تھا۔ حضرت مولانا گیلانیؒ کی ذاتِ بابرکات کا فیض حضرتِ اقدسؒ میں جاری ہوا اور شیخ اکبر قدس سرہ العزیز کے علوم و معارف آپؒ کی زبانِ اقدس پر جاری ہوئے۔ حضرتِ اقدسؒ کے خلیفہ حضرت عبدالقیوم صبا علیہ الرحمۃ اپنی مجالس میں اپنے شیخِ عالی مقام کے علم و عرفان سے معمور فقرات اکثر دہراتے کہ

ایک کو خواہ مخواہ دو کہنے کی کیا ضرورت ہے! چشمِ احول کو ایک
کے دو دکھائی دیتے ہیں۔

اسی دوران سرزمینِ حیدرآباد دکن کی کوکھ سے جنم لینے والی عظیم شخصیت قائدِ ملت جناب نواب بہادر یار جنگ سے آپؒ کی شناسائی ہوئی اور یہ شناسائی اور تعلق وقت کے ساتھ کن جذبات و احساسات میں ڈھل گیا اِس کا اظہار حضرتِ اقدس کی تصنیف حیاتِ بہادر یار جنگ میں بخوبی دیکھا جا سکتا ہے۔ گرامی قدر نواب صاحب کے دل میں امتِ مسلمہ کے زوال کا جو درد تھا اور پھر ملتِ اسلامیہ کی سربلندی کے لئے انہوں نے جس جانفشانی اور جوانمردی سے تگ ودو کی وہ دعوت و عزیمت کا ایک نیا باب ہے۔ بھلا ایک ایسی ہستی جس کے شب و روز امتِ محمدیہ کی سرفرازی کے اضطراب میں گزرتے ہوں اُن سے دلی تعلق تو ہونا ہی تھا سو حضرتِ اقدسؒ کو بھی جناب نواب صاحب سے دلی تعلق تھا۔ حیاتِ بہادر یار جنگ اس وقت کے نامور مفسر اور ادیب جناب عبدالماجد دریابادی علیہ الرحمۃ اور حضرتِ والا میں تعلق کا باعث بنی اور بعدازاں یہ سرسری راہ و رسم ایک تعلقِ خاطر کی صورت اختیار کر گئی۔ رقعاتِ ماجدی اس تعلقِ خاطر کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

زندگی کے اکتیس سال بیت چکے تھے اور اس دوران عظیم علمی و روحانی شخصیات سے بھی آپؒ کا ربط و ضبط رہا لیکن دل و نگاہ کو جہاں پہنچنا اور ٹھہرنا تھا اُن سے ملاقات ابھی نہیں ہوئی تھی۔ حضرتُ الشیخ علامہ سید سلیمان ندوی علیہ الرحمۃ حیدرآباد دکن تشریف لائے ہوئے تھے اور حضرت عبدالباری ندویؒ کے گھر قیام فرماتھے۔ حضرتِ والا بھی ان کی خدمتِ اقدس میں ایک طالبِ علم کی حیثیت سے حاضر ہوئے۔ حضور سید صاحب سے کافی دیر گفتگو رہی جس کا حوالہ پہلے گزر چکا ہے، بس پھر اُس ملاقات کا پہلا لمحہ غالباً وہیں تھم گیا اور حضرتِ اقدس انہیؒ کے ہو لئے۔

ترے ہی در پہ مٹ جانا لکھا تھا میری قسمت میں
ازل میں یا ابد میں، مَیں کہیں ہوتا یہیں ہوتا

شیخ اور مرید کا تعلق کہاں سے شروع ہوا اور کس معراج تک پہنچا فریقین کے سوا کسی کو بھی کیا خبر! خود مرید بھی تعلق کی پہنائی کو کہاں پا سکتا ہے البتہ جو کچھ اور جتنا کچھ زبان اور الفاظ کی گرفت میں آ سکتا تھا اسے ہم حضرتِ اقدسؒ کی تصنیفِ لطیف تذکرۂ سلیمان میں ملاحظہ کر سکتے ہیں۔

میانِ عاشق و معشوق آں رمزیست
کراماً کاتبیں را ہم خبر نیست

اپنے شیخِ عالی مقام کا فیض اور حضرتِ اقدس کی ازلی ابدی استعداد کہ تھوڑے عرصہ میں ہی علوم و معارفِ قرآن و حدیث میں رسوخ حاصل ہو گیا لیکن فنائیت ایسی تھی کہ اپنے مرشدِ کامل کے وصال کے بعد بھی کسی صاحبِ نسبت بزرگ سے اصلاح کے تعلق کو اپنے لئے لازم سمجھا اور اولاً حضرت مولانا عبدالباری ندوی علیہ الرحمۃ سے اور ثانیاً حضرت مولانا فقیر محمد کیملپوری علیہ الرحمۃ سے تعلق استوار فرمایا۔ مفتیٔ اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع علیہ الرحمۃ کی مجالس کے مستقل حاضر باش رہے۔ یہ تینوں حضرات حضرتِ اقدس و اعظم • مولانا اشرف علی تھانوی اعلیٰ اللہ مقامہٗ کے اجل خلفاء تھے۔

تالیف و تصنیف

تالیف و تصنیف سے حضرتِ اقدسؒ کو خاص مناسبت تھی اسی لئے اپنے مشرب و موقف کا اظہار اپنی تصانیف ہی میں فرمایا۔ زبان کی خوبصورتی اور فقرات کا دروبست تو ایک مسلمہ حقیقت ہے ہی، آپؒ کی تصانیف میں علم و عرفان کی جو خوشبوئیں ہیں وہ سالکینِ طریق کے لئے مشامِ جاں کا درجہ رکھتی ہیں۔

حضرت کی سب سے پہلی تصنیف حیاتِ بہادر یار جنگ ہے جس کے ابتدائی ایڈیشن نفیس اکیڈمی حیدرآباد دکن سے ۱۹۴۷ء اور ۱۹۴۸ء میں زیرِ عنوان قائدِ ملت شائع ہوئے تھے۔ حیاتِ بہادر یار جنگ کے عنوان سے اس کے تین ایڈیشن

بہادر یار جنگ اکیڈمی کراچی سے شائع ہوئے۔ کتاب کا پیش لفظ مولانا عبدالماجد دریا آبادیؒ نے تحریر فرمایا۔ اس تصنیف میں مسلمانانِ ہند کے عظیم سیاسی و سماجی رہنما اور جناب قائدِ اعظمؒ کے معتمد ساتھی جناب نواب بہادر یار جنگ کے حالاتِ زندگی، اُن کے سماجی و اصلاحی کارناموں اور ان کے سیاسی سفر کی داستان بیان کی گئی ہے۔ کتاب کو پڑھ کر بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ جب واقعی ملت کا درد دل میں جاگتا ہے اور ملتِ اسلامیہ کی شیرازہ بندی کا مصمم ارادہ قلب میں جاگزیں ہو جاتا ہے تو پھر کس طرح ایک فہیم اور شجاع مسلمان قلوب میں انقلاب برپا کر دیتا ہے، لیکن ایمانی فہم اور ایمانی شجاعت لازم ہے۔

حضرت ممدوحؒ کی دوسری تصنیف حیاتِ اشرف (سوانح حضرت مولانا اشرف علی تھانوی علیہ الرحمۃ) ہے۔ یہ کتاب پہلی بار ١٩٥١ء میں کاروانِ ادب کراچی سے اور دوسرا ایڈیشن مکتبۂ تھانوی کراچی سے ١٩٦٣ء میں شائع ہوا۔ حیاتِ اشرف میں حضرتِ اقدس نے حضرت مجدد تھانوی قدس سرہٗ العزیز کی حیات اور اُن کی مجددانہ شان کے بارے میں تمام بنیادی معلومات کو نہایت سادہ اور پرتاثیر پیرائے میں پیش کیا ہے۔ حضرت تھانویؒ کی ذاتِ اقدس اور اُنؒ کے علوم و معارف کو جس اختصار سے پیش کیا گیا یہ حضرتِ والا کی خداداد تصنیفی صلاحیتوں کی روشن دلیل ہے۔ یہ کتاب مشائخین اور سالکینِ طریق کے لئے ایک مشعلِ راہ ہے۔

تذکرۂ سلیمان حضرتِ اقدسؒ کی تیسری تصنیف ہے جسے آپؒ کی مرکزی تصنیف کہا جا سکتا ہے۔ کتاب کا پہلا ایڈیشن مجلسِ علمی کراچی سے ١٩٦٠ء میں شائع ہوئی اور دوسرا ایڈیشن مع اضافات ادارۂ نشر المعارف کراچی سے شائع ہوا۔ طرزِ تحریر عارفانہ اور محققانہ ہے۔ کتاب صرف ایک تذکرہ یا سوانح نہیں بلکہ اس میں سالکینِ طریق کے لئے گرانقدر رہنمائی بھی موجود ہے۔ کتاب کا ایک حصہ سلوکِ سلیمانی پر مشتمل ہے جس میں حضرتِ اقدس نے اپنے شیخِ عالی مقامؒ سے اپنی مکاتبت کو شائع کیا ہے جو بلاشک وشبہ نبوی سلوک کا ایک واضح اور متعین لائحہ عمل ہے۔ جس طرح حضرت سید سلیمان ندویؒ کی ذات مختلف نقطہ ہائے نظر کے دانشور حضرات اور تمام سلاسلِ تصوف کے مشائخ کے ہاں معتبر ومحبوب

تھی، ان کا تذکرہ بھی سب کی نگاہ میں معتبر رہا۔ یہ کتاب نہ صرف حضرت سید صاحبؒ کی حیات کے تمام پہلوؤں کی نقشہ کشی ہے بلکہ تاریخِ مسلمانانِ ہند اور تحریکِ پاکستان کے کئی گوشوں کو بھی اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔

حضرتِ اقدس کی چوتھی تصنیف علامہ سید سلیمان ندویؒ اور حیدر آباد آصفی کے نام سے بہادر یار جنگ اکیڈمی کراچی سے ۱۹۸۸ء میں شائع ہوئی۔ اس تالیف کا مقصد ہیرو ورشپ (hero worship) کا جذبہ ہے نہ وطن برتری کا تقاضا بلکہ احسان شناسی ہے جو عین اسلامی ایمانی جذبہ ہے۔ اس کتاب میں آصف جاہی اقتدار اور حضرت علامہ سید صاحبؒ کے تعلق کی روشنی میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ برصغیر میں مسلم اقتدار کے آنے، رہنے اور پھر اقتدار کے چھن جانے کی مرحلہ وار، مستند اور مفصل تاریخ مرتب کیے بغیر مستقبل کے نقشۂ عمل کی نتیجہ خیز تشکیل ممکن نہیں۔

موت الابرار حضرتِ اقدس کی پانچویں تصنیف ہے جو ادارۂ نشر المعارف کراچی سے ۱۹۸۸ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب میں ملتِ محمدیہ کے اُن پاک طینت اور خوش بخت صالحین کے سکرات و اموات کے واقعات پیش کیے گئے ہیں جن کا حسنِ خاتمہ کھل کر دنیا کے سامنے آیا یعنی اسی دنیا میں جنابِ حق تعالیٰ نے لوگوں پر منکشف فرما دیا۔ کتاب عاشقانہ رنگ میں لکھی گئی ہے اور اس آیتِ مبارکہ اِنَّ الَّذِینَ اٰمَنُوا اَشَدُّ حُبًّا لِلّٰہِ کا عکس لئے ہوئے ہے۔

رموزِ سورۂ یوسف حضرتِ اقدسؒ کی چھٹی تصنیف ہے جو ادارۂ نشر المعارف کراچی سے ۱۹۹۲ء میں شائع ہوئی۔ اس تحریر کے ذریعے حضرتِ اقدسؒ نے اس شرعی اور عقلی اصول کی اہمیت واضح فرمائی کہ جب تک ملتِ محمدیہ کی تعمیر جہاد بالنفس کے اوّلین اہتمام کے ساتھ جہاد بالسیف کے جذبہ پر نہیں کی جائے گی اس وقت تک اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔ اس اصول کو نظر انداز کر کے ملت کی سربلندی کا خواب ایک خام خیالی ہے۔

حضرتِ اقدسؒ کا تحریر کردہ مختصر مگر جامع رسالہ گلدستۂ نماز بہت اہمیت کا حامل ہے

جس کا آخری ایڈیشن دعوۃ اکیڈمی اسلام آباد سے شائع ہوا۔ اس رسالہ میں چاروں آئمہ کرام رحمہم اللہ علیہم اجمعین سے مروی نماز کی مسنون ہیتیں جمع کردی گئیں ہیں اور یہ ایک ایسا آئینہ ہے جس میں ہر ایک مسلمان (چاہے جن بھی امام کا مقلد ہو) وہ اس آئینے میں صلوٰۃِ رسول کی ہر ظاہری ہیئت بے غبار دیکھ سکتا ہے۔ گلدستۂ نماز کے مطالعے سے تمام مذاہبِ فقہہ کے ماننے والوں میں یہ شعور بیدار ہوسکتا ہے کہ ہر مسلمان اسوۂ رسول ہی کی پیروی کر رہا ہے۔ ایک لمبے عرصے سے لوگ ایک دوسرے پر فتویٰ طرازی کا جو شیوہ اختیار کیے ہوئے ہیں کاش اس مختصر رسالے کو ذرا قلب کو ہر تعصب سے پاک کر کے پڑھ لیں اور اس پر عمل پیرا ہو جائیں تو بہت سارے خود تراشیدہ مسائل سے جنابِ حق تعالیٰ ہمیں آزاد فرما دیں۔

یہاں پر حضرتِ اقدسؒ کی مدون کردہ کتاب مقالاتِ احسانی کا ذکر بے جا نہ ہو گا جو کہ حضرت مولانا مناظر احسن گیلانیؒ کے اُن نوٹس (notes) کا مجموعہ ہے جو حضرت گیلانیؒ شیخ اکبر حضرت محی الدین ابنِ عربی اعلیٰ اللہ مقامہٗ کی الہامی تصنیف فتوحاتِ مکّیہ اور حضرت مولانا جلال الدین رومی اعلیٰ اللہ مقامہٗ کی مثنوی معنوی کے مطالعے کے دوران تحریر فرماتے تھے۔ کتاب کے آغاز میں تصوف پر حضرتِ اقدس ڈاکٹر غلام محمد علیہ الرحمۃ کا تحریر کردہ مضمون ہے جو کہ اپنی نوع کی ایک منفرد تحریر ہے۔ اس کتاب کے پیش لفظ میں حضرتِ اقدسؒ نے اپنے استاذ المکرّم حضرت گیلانیؒ کے مشرب و منہج پر سیر حاصل گفتگو بھی فرمائی ہے۔ کتاب کا پہلا ایڈیشن مجلس علمی کراچی کی طرف سے شائع ہوا۔ کافی عرصے کے بعد ایک مشہور ادارے نے اس کا دوسرا ایڈیشن شائع کر کے سالکین پر احسان فرمایا ہے، خدا انہیں جزائے خیر عطا فرمائے۔ اس نئے شائع شدہ ایڈیشن میں حضرتِ اقدسؒ کے تحریر کردہ دیباچہ میں کچھ فقرات بریکٹس (brackets) میں لکھ دیے گئے ہیں جو غالباً علم یا اطلاع کا تو نہیں البتہ اعتراض کا رنگ بھرپور لئے ہوئے ہیں۔ کتاب کا شائع ہو جانا ضروری تھا، باقی اعتراضات ہوں یا استہزائیات، انہیں ثبات کہاں!
حضرت ڈاکٹر غلام محمد علیہ الرحمۃ کی زندگی شریعت و طریقت کی یکجائی کی گواہ تھی جس میں

دوئی کا شائبہ بھی نہیں تھا۔ وسیع المشربی کا یہ عالم تھا کہ تمام مکتبِ فکر کے مشائخ اور علماء سے آپ کے روابط تھے اور حضرتِ اقدس کی کسی تحریر یا تقریر سے یہ تأثر مل ہی نہیں سکتا کہ آپ کسی خاص فقہی مکتبِ فکر یا کسی خاص صوفی مکتبِ فکر کے مبلغ تھے بلکہ آپؒ نے خود کو دینِ محمدی کا ایک غلام سمجھا اور اسی منہج و مشرب کی ترویج فرمائی اور سلاسل اور مسالک سے بلند ہو کر زندگی بسر فرمائی۔

احمد تو عاشقی بمشیخت تُرا چہ کار

دیوانہ باش سلسلہ شد شد نہ شد نہ شد

دینِ محمدی کسی صوفی سلسلہ اور فقہی مسلک میں محدود و محصور ہو کر نہیں رہ گیا بلکہ یہ تو وہ 'جادۂ حیباں' ہے جو ہمہ وقت ہر اُس سالک کے لئے کھلا ہے جو 'مجالِ آبلہ پائی' کے لئے کمر بستہ ہو۔ آپؒ کی ذاتِ مبارکہ ایک ایسا منشور تھی کہ جس سے سلوکِ نبوی کے مختلف رنگ منعکس ہوئے اور آپؒ نے اپنے گیارہ متوسلین کو خرقہ عطا فرمایا۔ ۱۷ دسمبر ۱۹۹۳ء کو آپؒ اپنے خالق و مالک سے جا ملے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیہِ رَاجِعُون۔

سلامٌ علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ

کیا تصوف عجمی چیز ہے؟

(حضرت شاہ زوار حسین مجددی نوراللہ مرقدہ کی یاد میں ایک جلسہ ہوا تھا اور اس میں مجھ ہیچمدان کو بھی کچھ عرض کرنا پڑا تھا، بعض اسباب ایسے پیدا تھے کہ ذہن کو سکون میسر نہ تھا پھر بھی حضرت شاہ صاحب نور اللہ مرقدہ کی محبوبیت اور بانیانِ جلسہ کے خلوص کی یہ برکت ظاہر ہوئی کہ جب کھڑا ہوگیا تو ایک گونہ شرح صدر بھی میسر آیا اور زبان بھی کھل گئی۔ اس تقریر کو ٹیپ کر کے قلمبند کرلیا گیا اور ہمارے مکرم و محترم اخلاصِ مجسم الحاج محمد اعلیٰ صاحب (اعلیٰ اللہ درجاتہ) کا مشورہ ہوا کہ اس تقریر کو مضمون کی صورت میں لے آوں۔ مجھے اس میں تامل یہ رہا کہ ایک ''آمد'' کو ''آورد'' میں بدلنے سے اس کی روح باقی نہیں رہے گی۔ اس لیے معذرت کے ساتھ صرف اتنا کردیا ہے کہ جہاں جہاں خطابی الفاظ آگئے تھے انہیں حذف کردیا ہے۔ انشاء اللہ یہی موثر و مفید رہے گا۔)

ایک بات جو عرض کرنا چاہتا ہوں اور جو اپنے ملک سے لے کر یورپ تک سارے علاقوں کے مسلمانوں کے اندر میں نے دیکھی وہ تصوف پہ یہ الزام ہے کہ یہ عجمی چیز ہے۔ حالانکہ الفاظ و اصطلاح کے اندر کچھ نہیں رکھا۔ ہم کو حقیقت دیکھنی چاہیے۔ بلاشبہ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی حیاتِ مبارکہ کے اندر ہم کو وہ سارے اذکار و اشغال و مراقبات اور وہ ساری تفصیلات نہیں ملتیں جو کہ بعد میں بزرگانِ دین کے مختلف طریقوں کے اندر رائج ہوگئیں۔ لیکن یہ چیزیں اگر ان کے ہاں موجود نہیں تھیں تو ان کا منشا اور ان کی اصل تو ساری وہاں موجود تھی۔ حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہ العزیز نے اپنے

مکاتیب میں پورے زور اور بڑی تاکید کے ساتھ اس بات کو بیان فرمایا ہے کہ تصوف کے جتنے مبادی ہیں وہ سب کے سب صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے ہاں ملتے ہیں، تفصیلات البتہ ان کی نہیں ملتیں اور وہ اسی وجہ سے نہیں ملتیں کہ اس کی ضرورت وہاں موجود نہیں تھی۔ حضور اکرم ﷺ کی ذات مقدسہ اس قدر قوی منبع فیضان تھی کہ اس کے ہوتے ہوئے ان تفصیلات کی ضرورت ہی لاحق نہیں تھی۔

میرے ایک استاد مولانا محمد صابر صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو بڑے جید عالم بھی تھے اور حضرت بشارت کریم نقشبندی مجددی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے خلفاء میں سے تھے انہوں نے مجھے یہ واقعہ سنایا (کسی کتاب میں میں نے نہیں پڑھا) کہ حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں ایک شخص اہل حدیث مسلک کے آئے اور یہ خیال لیے ہوئے آئے کہ شاہ صاحب اتنے بڑے محدث ہیں اور پھر بھی تصوف کی طرف مائل ہیں۔ جبکہ یہ ایک عجمی چیز ہے تو میں ان سے بات کروں گا کہ آخر یہ کیا معمہ ہے؟ اتفاقاً وہ وقت ایسا تھا کہ شاہ صاحب استراحت فرما رہے تھے۔ ان کے خادم سے انہوں نے عرض کیا کہ میں شاہ صاحب سے ملنا چاہتا ہوں۔ خادم نے کہا کہ شاہ صاحب تو اس وقت آرام فرما رہے ہیں اگر کوئی ایسی بات ہو کہ جس کے اندر میں آپ کی کچھ مدد کرسکوں تو ارشاد فرمائیں، میں حاضر ہوں، وہ تو بھرے ہوئے تھے ہی، انہوں نے کہا کہ میں یہ پوچھنے کے لیے آیا ہوں کہ آپ کے شاہ صاحب محدث ہیں اور محدث ہوتے ہوئے پھر تصوف کے کس طرح قائل ہیں اور صوفیانہ اشغال اور ساری چیزیں وہ کس طرح کرتے رہتے ہیں۔ خادم عالم تو نہیں تھے مگر شاہ صاحبؒ جیسے کامل کے صحبت یافتہ تھے انہوں نے جواب دیا آپ ہم تو شہر دہلی کے رہنے والے ہیں، ہم کو کسی مریض کے لیے خمیرہ گاؤزباں کی ضرورت ہو یا کسی اور دوا کی ضرورت ہو تو ہمیں شہر میں بنی بنائی تیار دوائیں مل جاتی ہیں لیکن مریض بہر حال مریض ہے شہر میں بھی مریض ہوتا ہے دیہات میں بھی مریض ہوتا ہے۔ دیہات کے اندر اگر کوئی مریض ہو اور اس کو ضرورت ہو گاؤ زبان کی اور طبیب یہ محسوس کرے کہ بغیر خمیرہ گاؤزبان کے کام نہیں چلے گا اور وہ چولہا جلائے اور اس کے اوپر پتیلی رکھے اس کے اندر

شیرہ بنائے، اس کو گھوٹنے لگ جائے، اس میں گاؤزبان ڈالے کوئی شخص باہر سے آ کر (دہلی والا) اس سے یہ کہے کہ صاحب آپ یہ سب کیا کرر ہے ہیں، یہ چیزیں تو ہمارے ہاں نہیں ہوتیں تو وہ کہے گا کہ بھائی تمہارے ہاں تو خمیرہ گاؤزبان بنا بنایا مل جاتا ہے ہم کو خمیرہ گاؤزبان کی ضرورت ہے مگر وہ بنا بنایا یہاں تیار نہیں ملتا، اس لیے ہمیں چولہا بھی جلانا پڑتا ہے، پتیلی بھی اس کے اوپر رکھنی پڑتی ہے، سارے جتن کرنے پڑتے ہیں تو بالکل یہی حالت تصوف کے معاملے میں بھی ہے کہ رسول مقبول ﷺ کا دورِ مبارک وہ مبارک دور تھا کہ جس میں ساری چیزیں پکی پکائی ملتی تھیں۔ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ کے دست حق پرست پر بیعت کی اور وہ اسی آن واصل باللہ ہو گیا۔ اور اگر حضور اللہ ﷺ کے متعلق آپ کا یہ عقیدہ نہیں ہے کہ وہ بہ یک نظر ایک طالب کو واصل باللہ کر سکتے تھے تو آپ نبوت کے امتیاز ہی سے بالکل نا آشنا ہیں کہ وہ کیا قوتِ فیضان ہوتی ہے اور نبی کس طرح ایک ہی وقت اِدھر اللہ سے واصل اور اُدھر مخلوق میں شامل ہوتا ہے اور ایسا برزخ کبریٰ ہوتا ہے جس میں حرفِ مشدّد کی سی کیفیت ہوتی ہے کہ اللہ سے لیتا اور بندوں کو پہنچاتا اور بندوں کا ہاتھ پکڑتا اور اللہ کے ہاتھ میں دیتا ہے۔ ایسی صورت میں تفصیلات کیا ملیں گی۔ پھر جب حضور اکرم ﷺ کا دورِ مبارک ختم ہوا اور خلفاء کا دور آیا تو چار خلفاء راشدین کہلاتے ہیں یہ سب کے سب رشد و ہدایت والے خلفاء تھے اور ''خلفاءِ راشدین'' کا کیا مفہوم ہے؟ اس کا یہ مفہوم ہے کہ جہاں ان جانشینانِ رسول ﷺ نے زمامِ حکومت اپنے ہاتھ میں لے رکھی تھی وہاں زمامِ اصلاح و تربیت باطنی بھی ان کے ہاتھ میں اسی قوت سے موجود تھی۔ یعنی یہ حضرات ظاہر و باطن کی جامعیت کو لیے ہوتے تھے اور علیٰ منہاج النبوت کام کرتے رہے، خلفائے راشدین کی سیرت مبارکہ کو آپ پڑھیں تو خود ان کی ذاتِ مبارکہ سے متعلق بھی اور ان کا جو طرز رعایا کے ساتھ تھا اس سے متعلق بھی آپ کو صاف طور سے یہ ملے گا کہ وہ تمام تر اپنی رعایا کے تزکیہ نفس اور اخلاص فی الدین کی طرف متوجہ تھے چنانچہ صحابہ کرامؓ میں جس درجہ احتسابِ نفس کی کیفیت ملتی ہے وہ آپ کو

کہیں اور نظر نہیں آئے گی۔ اپنا احتساب اور جن کے اوپر وہ مامور تھے ان کا احتساب!!!

دو ایک مثالیں سنئے: حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی مجلس آراستہ ہے ایک شخص آتا ہے جس سے آتے ہوئے بدنگاہی ہوگئی تھی۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ لوگوں کو کیا ہوگیا ہے کہ ان کی نگاہوں سے زنا ٹپکتا ہے اور بے محابا چلے آتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ ہر آنے جانے، ملنے ملانے والے بلکہ ہر فرد رعایا کے قلب و نفس کی اصلاح پر بھی خلیفہ راشد کی کڑی نظر ہوتی تھی اور اس کو اپنا فریضۂ منصبی سمجھتا تھا، اسی طرح خود احتسابِ ذاتی بھی ان خلفاء میں علانیہ ملتا ہے۔

دیکھئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے دورِ خلافت کے اندر لوگوں کو جمع کرتے ہیں کہ کچھ احکامات اور ہدایات عطا فرمائیں۔ جب لوگ جمع ہوجاتے ہیں اور آپؓ ان سے مخاطب ہونے کے لیے منبر پر چڑھتے ہیں تو فرماتے ہیں ''اے عمرؓ! تو وہی تو ہے جو کہ بکریاں چرایا کرتا تھا آج اسلام کی وجہ سے تجھے یہ عزت حاصل ہوئی ہے۔'' بس اتنا فرمایا اور منبر سے اتر گئے اور مجمع منتشر کردیا گیا بعد میں لوگوں نے پوچھا کہ یہ کیا قصہ تھا تو فرمایا کہ جس وقت میں منبر پر چڑھ رہا تھا تو میں نے اپنے نفس کے اندر تغیر پایا کہ آج میں اتنی عظیم الشان سلطنت کا والی ہوں۔ امیر المومنین ہوں۔ میں نے اپنی اس نفسانی کیفیت کا یہ علاج کردیا۔ دیکھا آپ نے کہ ان کی نگاہ تو اپنی اصلاح پر بھی تھی اور جو رعایا تھی ان کی روٹی، ان کے رزق ان کی آسائش اور ان کی جسمانی فلاح و صلاح کے ساتھ ساتھ بلکہ ان چیزوں سے بڑھ کر ان کے باطن کی اصلاح کی طرف بھی تھی۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا وہ واقعہ مشہور ہے کہ آپ نے ایک شخص کو گورنر مقرر کیا، فرمان بھی دیدیا، اتفاق کی بات ہے کہ راستے میں وہ ان کے ساتھ چلے جارہے تھے اور حضرت عمرؓ نے ایک بچہ سے پیار کیا اور انہوں نے یہ کہا کہ آپ بچے سے بھی پیار کرتے ہیں۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ معصوم بچے پر جب تم کو محبت اور پیار نہیں آتا اور اس پر ترس نہیں آتا تو تم اپنی رعایا کی کیا خبر گیری کرسکو گے اپنا فرمان واپس لے لیا تو یہ خلفائے راشدین تھے۔ یہ اسی لیے خلفائے راشدین کہلاتے ہیں کہ انہوں نے علیٰ منہاج

النبوت کام کرنے کی کوشش کی اور ختمِ نبوت کے بعد منصب نبوت کی ذمہ داریوں کو ٹھیک حضور اکرم ﷺ کے نہج پر ادا کرنے کی پوری کوشش کرتے رہے۔

ان خلفائے راشدین کے بعد کا دور جب آیا تو اس کے اندر قوانین شرعیہ کی تنفیذ گو برابر جاری رہی اور خلفائے بنی امیہ نے حکومت کا جو قانونی قالب ہے اس کو شریعت سے ہٹنے نہیں دیا لیکن اس کا جو باطنی پہلو تھا اس سے اپنے آپ کو الگ کرلیا اور اس کو اپنی عمل داری سے خارج قرار دے دیا۔ تزکیہ نفس اور تصفیہ قلب جس کی اس قدر تاکید قرآن مجید میں موجود ہے اور جس پر جنت کی بشارت مشروط رکھی گئی ہے اس سے جب انہوں نے اغماض برتا یا یہ سمجھا کہ اس فریضہ کو ادا نہیں کرسکتے تو اس صورتِ حال کو دیکھ کر وہ حضرات جنہوں نے خیرالقرون والے دور دیکھے تھے، انہوں نے یہ سوچا کہ اگر یہ معاملہ اسی طرح چلتا رہا تو اسلام ایک جسد بے روح بن کر رہ جائے گا۔ اس لیے انہوں نے تزکیۂ نفس کے اس پہلو کو سنبھال لیا۔

خلافتِ راشدہ کے ٹوٹنے سے ہمارے سیاسی ذہن والے احباب اس چیز کو روتے ہیں کہ جمہوریت ختم ہوگئی ملوکیت آگئی وغیرہ، حالانکہ رونے کا مقام تو یہ ہے کہ اسلام کی ظاہر و باطن کے اعتبار سے جو وحدت تھی اور شریعت بھی دراصل نام تھا اسی جامعیت کا اس کے اندر تفرقہ پڑ گیا۔ ظاہر شریعت کا نام فقہ ہوگیا اور باطن شریعت یعنی زہد، تقویٰ، اخلاص، فکرِ آخرت وغیرہ اس سے الگ ہوگئی۔ اسی احساسِ زیاں سے مضطرب ہوکر اور یہ دیکھ کر کہ اب تو اسلام کا صرف قالب اور ڈھانچہ باقی رہ جائے گا۔ روح اس سے نکل جائے گی۔ اسی روح کو اس وقت کے ارباب بصیرت نے سنبھالنے کی کوشش کی حضرت حسن بصریؒ ایک جگہ بیٹھ گئے۔ حضرت سلمان فارسیؓ ایک جگہ بیٹھ گئے۔ حضرت ابراہیم بن ادھمؒ کے ذریعہ ایک مرکز قائم ہوگیا اور اس زمانے میں اصلاحِ باطن کے اس کام کا نام تصوف تھا بھی نہیں بلکہ پہلے یہ ''عباد'' کہلائے پھر ''زہاد'' کہلائے، اس کے بعد ان کو صوفیاء کہا جانے لگا اور ان کے فن تربیت باطن کا نام تصوف پڑ گیا۔ لفظی اصطلاح سے کیا فرق پڑتا ہے۔ حقیقت کو دیکھنا چاہیے کیا یہ قرآن حکیم میں موجود نہیں کہ کچھ گنوار

دیہاتی حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں آئے اور انہوں نے اپنے ایمان کا ادعا ظاہر کیا اس پر فوراً یہ آیت پاک اتری وقالت الاعراب امنا قل لم تومنوا ولکن قولوا سلمنا ولما یدخل الایمان فی قلوبکم یعنی یہ قصباتی لوگ کہتے ہیں کہ ہم صاحب ایمان ہوگئے اے پیغمبر آپ ان مدعیوں سے فرما دیجئے کہ وہ یوں نہ کہیں یہ ٹھیک ہے کہ وہ مسلمان ہوگئے لیکن ابھی ایمان ان کے قلوب کے اندر راسخ نہیں ہوا ہے معلوم ہوا کہ مسلمان ہوتے ہوئے ''رسوخِ ایمان'' کے بغیر حالت معتبر نہیں۔ ضرورت اس کی ہے کہ حقائقِ ایمانی قلب ونظر میں رچ بس جائیں ''علم'' حال بن جائے بقول عارف:

مغرورِ سخن مشو کہ توحیدِ خدا
واحد دیدن بود نہ واحد گفتن

رسول اللہ ﷺ نے ۲۳ برس کے اندر یہ جو عظیم الشان اور محیرالعقول انقلاب پیدا فرمایا اس کی وجہ آخر کیا تھی؟ اس کی وجہ یہی تھی کہ جو کوئی بھی حضور اقدس ﷺ کی صحبت مبارکہ سے فیضیاب ہوا، ایمان اس کی رگ و پے میں سرایت کرگیا۔ وہ آخرت اور رضاء الٰہی کا ایسا طالب بن گیا کہ دنیا کی طمع، دنیا کی لالچ اور دنیا کی دلفریبیاں اس کی نگاہ سے بالکل گر گئیں اور وہ تمام تر آخرت کا دیکھنے والا اور آخرت کا طالب بن گیا۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کونوا ابناء الاخرۃ تم آخرت والے بنو، دنیا طلب مت بنو، تو یہ وہ پہلو تھا کہ جس کی وجہ سے ۲۳ برس کی قلیل مدت میں ایسا پاکیزہ انقلاب اور ایسے مقدس معلمین اخلاق کا بے مثال طبقہ پیدا ہوگیا جن کی نشست و برخاست بلکہ جن کی سانسوں میں برکات ہی برکات تھیں اور جن کی ہر حرکت میں تائید الٰہی کا کرشمہ نظر آتا تھا اور جن کی سادگی نے اس وقت کی متمدن دنیا کو روپوشی پر مجبور کردیا تھا۔

غرض اب بات یہ معلوم ہوئی کہ آج جس حقیقت کا نام تصوف پڑ گیا ہے۔ یہ کوئی عجمی چیز نہیں، یہ روح اسلام ہے۔ شریعت کا وہ باطنی پہلو ہے جس کے بغیر ظاہری اعمال بے روح ہوجاتے ہیں۔ قرآن کریم میں جہاں نماز کا حکم ہے اسی کے ساتھ خاشعین کی تعریف ہے کہ جب تک خشوع نہ پیدا ہو اس وقت تک جو حاصل ہونا چاہیے وہ بات

حاصل نہیں ہوئی۔ زکوٰۃ کا حکم ہے لیکن اس کے ساتھ بے ریائی اور اخلاص کا بھی حکم ہے۔ صدقہ و خیرات کا حکم ہے لیکن صرف اللہ تعالیٰ کی محبت میں ڈوب کر کھلانے پلانے والے کی تعریف کی گئی ہے۔ تجارت و زراعت کو منع نہیں کیا گیا لیکن مطالبہ اس بات کا ہے کہ ایسے بنو جیسے حضور اکرم ﷺ کی جمعیت تھی کہ رجال لا تلھیھم تجارۃ ولا بیع عن ذکر اللہ کہ یہ وہ لوگ ہیں جن کو تجارت و زراعت اللہ تعالیٰ کی یاد سے غافل نہیں ہونے دیتی۔ دل اللہ تعالیٰ کے ساتھ لگا رہے اور ہاتھ کام میں مصروف رہیں۔ بہرحال انسان بنتا ہے انسان سے۔ ایک مربی اور ایک معلم کی ضرورت اشد درجے کی ہوتی ہے۔ تاریخ ہدایت اس بات کی گواہ ہے کہ کبھی کبھی نبی آیا اور کتاب اس کے ساتھ نہیں تھی مگر یہ کبھی نہیں ہوا کہ کتاب آئی ہو اور نبی اس کے ساتھ موجود نہ ہو۔ وجہ یہی ہے کہ تربیت اخلاق اور تزکیۂ نفس کے لیے علم لفظی کبھی بھی کافی نہیں ہوسکتا۔ مربی اخلاق کا ہونا ضروری ہے جس کا عرفی نام شیخ طریقت یا پیر طریقت ہے۔ حضرت علی متقیؒ کا ایک چھوٹا سا رسالہ ہے تصوف کے اوپر ''تبیین الطرق الی اللہ'' اس میں وہ لکھتے ہیں کہ بغیر کسی پیر کے، بغیر کسی شیخ کے (اور ظاہر ہے کہ جب ہم شیخ اور پیر کہیں گے تو اس سے ہماری مراد وہی شخص ہے جو حضور اقدس ﷺ کے نقش قدم پر قائم ہو) وصول الی اللہ میسر نہیں آتا اور اگر کبھی ایسا ہوا ہے کہ بغیر طریقت کے کسی کو نسبت مع اللہ حاصل ہوگئی ہے تو فرماتے ہیں کہ یہ نادراً اجداً یعنی بہت ہی نادر طور پر ہے۔ بعض علماء کہتے ہیں کہ شیخ بنانا ضروری نہیں۔ شریعت و سنت کی پابندی سے انسان کامل ہوسکتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کی تھوڑی سی وضاحت ہوجائے کہ کبھی کبھی بلاشبہ ایسا ہوتا ہے کہ بغیر کسی شیخ اور بغیر کسی مرشد سے تعلق قائم کیے ہوئے کو بھی نسبت مع اللہ حاصل ہوجاتی ہے لیکن جیسے کہ شیخ علی متقیؒ فرماتے ہیں کہ یہ نادراً اجداً ہے۔ نادر مثالوں سے اصول نہیں بنا کرتے، پس اصول تو وہی باقی رہا نسبت ملے گی۔ اصلاحِ باطن ہوگی شیخ کے زیر تربیت آنے سے۔ نادرات اور مستثنیات سے اصول نہیں بنا کرتے۔ عارف و شیخ محقق حضرت مولانا رومؒ نے اس کی مزید تشریح کی ہے کہ کبھی کبھی جو تم دیکھتے ہو کہ اس طرح کا کوئی کامل بھی بن جاتا ہے تو وہ نامعلوم طور پر اہل

اللہ کی توجہات ہی کے سبب سے بنتا ہے خود اس شخص کو پتہ نہیں چلتا لیکن اہل ہمم کی ہمتیں اس کے ساتھ ضرور ہوتی ہیں۔ مولانا فرماتے ہیں:

یار باید راہ را تنہا مرو | از سرخود اندریں صحرا مرو
ہر کہ تنہا نادراً ایں رہ برید | ہم بعون ہمت پیراں رسید

امام شعرانیؒ نے لکھا ہے کہ ایک دفعہ میں کشتی میں بیٹھا جارہا تھا اور میرے شیخ بھی میرے ساتھ موجود تھے۔ ہم نے یہ دیکھا کہ ایک شخص پانی کے اوپر پیدل چلا جارہا تھا میرے شیخ نے مجھ سے کہا کہ دیکھو یہ شخص جو پانی پر پیدل چلا جارہا ہے لوگ اسے کتنا بزرگ سمجھیں گے حالانکہ اس کو اس وقت جو ہمت پہنچ رہی ہے اور جو فیضان ہے وہ اس بوڑھے کا ہے جو اسی کشتی میں کنارے بیٹھا ہے تو بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ اس طرح نادر طور پر کبھی جو کامل بھی ہوجاتا ہے تو اس سے اصلاح باطن کا کام آگے نہیں بڑھتا۔ یہاں تو دیئے سے دیا جلتا رہتا ہے اسی لیے حضور اکرم ﷺ کو ''سراج منیر'' فرمایا کیونکہ ایک چراغ سے دوسرا چراغ جلتا رہتا ہے۔ غرض بیعت کی نسبت جب تک حضور اکرم ﷺ کے ساتھ استوار نہیں ہوجاتی اس وقت تک فیضان عموماً دوسرے کو بھی نہیں ملتا۔ دوسری طرف جو شیخ ہوتا ہے اس کے مدارج بھی دراصل طالبین کے طفیل میں بڑھتے چلے جاتے ہیں اور اس پر بھی فیضان الٰہی بڑھتا جاتا ہے۔ جب طالب ہوتا ہے ذی استعداد تو چونکہ اس کا رزق اللہ تعالیٰ نے اسی شیخ کے پاس رکھا ہے۔ اس لیے اس پیر کے اندر بھی اللہ تعالیٰ استعداد بڑھا دیتے ہیں۔ ایک مثال سے یہ بات ذہن نشین ہوجائے گی۔

جولائی ۱۹۶۱ء میں لکھنؤ حاضر ہوا۔ حضرت مولانا عبدالباریؒ میرے شیوخ میں سے ہیں اور مجھ پر شفیق بھی بے حد تھے۔ قیام لکھنؤ کے دوران حضرت نے فرمایا کہ ''ایک دن میں آپ کے پاس آیا کروں گا اور ایک دن آپ میرے پاس آیا کریں'' میں ٹھہرا تھا اپنے شیخ حضرت علامہ سید سلیمان ندوی نور اللہ مرقدہٗ کے داماد کے پاس جو کہ گورگنج میں قیام پذیر تھے اور حضرت کا دولت کدہ شبستان قدم رسول میں تھا۔ بہر کیف یہ معمول چلتا رہا۔ ایک روز جو میرے جانے کا دن نہیں تھا۔ حضرت مولانا کے ذہن میں یہ رہا کہ یہ

میری حاضری کا دن ہے اور اس روز وہ تشریف نہیں لائے۔ اور دوسرے دن جب میں پہنچا تو فرمانے لگے کہ کل آپ نہیں آئے میں انتظار کرتا رہا۔ میں نے عرض کیا حضرت کل تو آپ کی تشریف آوری کی باری تھی۔ فرمایا ''ہاں میں بھول گیا لیکن کوئی بات نہیں مجھے کھانا تو مہمان والا مل گیا ورنہ وہی روز کا کھانا ملتا۔ واقعی حضرت نے بڑے پتہ کی بات فرمائی۔ تو میں یہ بتا رہا تھا کہ یہ جو مرید مہمان بن کر آتے ہیں تو شیخ فانی تو یہی سمجھتا ہے کہ اس کے طفیل اس کو بھی مہمان والا کھانا مل جاتا ہے۔ عجیب نظام ہے اور اللہ تعالیٰ نے یہ سلسلہ ایسا رکھا ہے کہ اس میں تفاخر اور تکبر کی جڑ کٹ جاتی ہے اور افادہ اور استفادہ کا سلسلہ بھی چلتا رہتا ہے۔

آج عام طور پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ صاحب تصوف ایک عجمی چیز ہے حالانکہ یہ بالکل عجمی چیز نہیں۔ یہ خالص مکی مدنی چیز ہے البتہ جس اسلام کا آج ڈھنڈورا پیٹا جارہا ہے وہ اسلام نہیں ہے جو حضرت محمد ﷺ لے کر آئے تھے۔ بلکہ یہ تو اسلام کا وہ خاکہ ہے جو کبھی مارکسزم کے ڈھانچے کے اوپر بنایا جاتا ہے اور کبھی کسی ازم کے قالب پر اس کو ڈھالنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ محمد ﷺ جو دین لے کر آئے تھے اس میں تزکیہ تو اولین درجہ کی اہم چیز ہے۔ قرآن پاک میں تزکیہ سے متعلق بہت آیات آئی ہیں جن کے منجملہ سورہ جمعہ والی آیت بھی ہے اور وہ خاص طور پر قابل ذکر اور غور طلب ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے اپنے آپ کو الملک، القدوس، العزیز اور الحکیم قرار دیا ہے۔ اور چار اسمائے حسنیٰ گنانے کے بعد حضور ﷺ کے متعلق فرمایا کہ آپ کے منصب کے یہ فرائض ہیں یتلوا علیھم اٰیٰتہ ویزکیھم ویعلمھم الکتاب والحکمۃ اس طرح چار اسماءِ ربانی لاکر حضور کے چار فرائض منصبی کو بیان کیا گیا ہے۔ اس آیت پاک میں فنی لحاظ سے لف ونشر مرتب ہے کہ وہ ''ذات قدوس'' کا بھیجا ہوا نبی ''مزکی'' بنا کر بھیجا گیا ہے تاکہ وہ لوگوں کا تزکیہ وتصفیہ کرکے پاک کرے۔ پس تلاوتِ آیات یعنی دعوتِ اسلام پیش کرنے کے بعد اس کے ماننے والوں سے متعلق نبی کا فریضہ اولین ان کا تزکیہ نفس ہی ہے۔

آج کے دور میں مسلمانوں کو سب سے بڑا فریب حصول حکومت و اقتدار کا لگا

ہے۔ اور یوں سمجھا جاتا ہے کہ اقتدار اور حکومت نہیں تو پھر مسلمان کیا مسلمان ہے۔ حالانکہ یہ تصور صحیح نہیں ہے۔ حکومت کے بغیر ایک مومن کامل مومن بن سکتا ہے ہے اور حکومت کا مل جانا اس بات کی ہرگز نشانی نہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کا مقبول اور کامل بندہ بن گیا۔ اصل شے اندر ہے۔ اور آج کے ماہرین نفسیات بھی اس بات کو خوب جانتے ہیں کہ خارج کوئی چیز نہیں، نہ خارج میں فساد ہے اور نہ خارج میں صلح و امن ہے جو کچھ ہے اندر ہے۔ میرے اندر صلح و امن ہے تو خارج امن سے معمور ہے اور میرے اندر اگر فساد موجود ہے تو خارج میں بگاڑ ہی بگاڑ ہے۔ دیکھیے یہی نگاہ ہے کسی طرف اٹھتی ہے تو محبت پیدا کردیتی ہے اور یہی نگاہ ہے کہ کسی کی طرف اٹھتی ہے تو بغض و کینہ پیدا کردیتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ نگاہ اٹھتی ہی محبت یا بغض سے ہے۔ غرض جو کچھ ہے اندر ہے، انبیاء علیہم السلام اس اندر کی چیز کی اصلاح کے لیے آئے۔ ان کا خاص فریضہ منصبی یہی رہا ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے کہ یہ قرآن شفاء لما فی الصدور کا وصف رکھتا ہے یعنی سینوں کے اندر جو پلیدگی اور روگ لگے ہوئے ہیں ان کو دور کر کے معنوی صحت عطا کرتا ہے فی قلوبھم مرض یعنی یہ جو سینوں کے روگ ہیں ان کی شفا کے لیے یہ آبِ حیات ہے۔

آج اپنے ملک سے زیادہ باہر کے ملکوں میں جا کر دیکھیے کہ ہندو اپنے یوگ اور آسنوں کا کس قدر پرچار کر رہے ہیں اور ان بے حقیقت حربوں کے ذریعے کوشش کر رہے ہیں کہ لوگوں کو ہندومت کی طرف بلائیں۔ اس وقت ضرورت ہے کہ ہم تزکیہ نفس سے آراستہ ہوکر اور اپنے قلوب میں توحید کی شمع روشن کر کے حضور اکرم ﷺ کے اسوہ حسنہ کو مشعل راہ بناتے ہوئے چار دانگ عالم میں پھیل جائیں اور دینِ خالص اور مشربِ محمد ﷺ کو انسانیت تک پہنچائیں۔ یہ اس وقت کا سب سے بڑا تقاضا ہے۔ یاد رکھیے کہ جب تک قلب ہمارا پاک نہیں ہوگا اور جب تک ہمارا قلب کے اندر تعلق مع اللہ پیدا نہیں ہوگا اس وقت تک نہ ہماری بات میں تاثیر ہوگی اور نہ ہم اس وقت اسلام کے صحیح داعی بنیں گے۔

بہت سے رذائل ایسے ہیں کہ آسانی سے زائل نہیں ہوتے خصوصاً کبر۔ یہ ایسی

دقیق چیز ہے کہ محققین کہتے ہیں کہ یہ عبادت کے ساتھ بھی پرورش پاتا رہتا ہے۔ اس کو کون نکالے؟ اس کو کوئی صاحبِ نظر طبیبِ روحانی ہی نکال سکتا ہے۔ مولانا رومؒ، شیخ فرید الدین عطارؒ اور امام غزالیؒ کہتے ہیں کہ بغیر شیخ کامل کی صحبت و تربیت کے نفس تو مرتا ہی نہیں۔ اس کی اصلاح ہی نہیں ہوتی۔ انسان اپنے آپ کوشش بھی کرے تو بہت سی غلط فہمیوں کے اندر مبتلا ہوجاتا ہے۔ یہاں اصل اور نقل کے ڈانڈے ملے ہوئے ہیں۔ مثلاً تواضع ہے اور تذلّل ہے۔ ذلتِ نفس کی ممانعت ہے اور تواضع کا حکم ہے یا مثلاً تحدیثِ نعمت ہے اور اظہار کہ تحدیثِ نعمت کا تو حکم ہے مگر اظہار اور فخر کی ممانعت ہے۔ اب تحدیثِ نعمت اور اظہار کے ڈانڈے ایسے ملے ہوئے ہیں کہ آپ اپنے آپ اس کے فرق کو کیا سمجھیں گے جب تک کوئی صاحب نظر دیکھ کر یہ بتلائے کہ اس وقت تم جو بات کررہے ہو اس کے اندر تحدیثِ نعمت ہے یا اظہارِ نفسانی ہے۔ اسی طرح بعض دفعہ یہ ہوتا ہے کہ ایک سالک طریق تواضع سے نکل کر مذلت کے درجے تک پہنچ جاتا ہے۔ اس کو شیخ ہی پہچانتا ہے اور پھر وہ اس کو وہاں سے نکالتا ہے اور نقطۂ تواضع پر لاکر قائم کردیتا ہے۔ تو یہ ساری چیزیں ایسی ہیں کہ آج کم از کم وہ حضرات جو ظاہری علوم نفسیات و تحلیل نفسی پڑھتے ہیں وہ بھی اس کا انکار نہیں کرسکتے گو ان کو اس کی حقیقت کی ہوا بھی نہیں لگی۔

اسلام کا نظام روحانی

الحمد للہ الاحد الواحد القدیم و الصلوٰۃ والسلام علیٰ حبیبہ الافخم سیدنا و مولانا محمد النبی الامی و علیٰ الہ و صحبہ اجمعین۔۔ امابعد سورۂ اعراف کی آیت نمبر۱۷۲ میں ایک حقیقت امری کی نشاندہی یوں فرمائی گئی ہے:

واذ اخذ ربك من بنی ادم من ظهورهم ذريتهم
واشهدهم علی انفسهم ج الست بربكم قالوا بلیٰ
شهدنا ان تقولوا يوم القيمة انا لنا عن هذا غفلين

جبکہ (اے محمد) آپ کے رب نے اولاد آدم کی پشت سے انکی اولاد کو نکالا اور ان سے انہی کے متعلق اقرار لیا کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ سب نے جواب دیا کیوں نہیں، ہم سب گواہ ہیں، کبھی کہنے لگو قیامت کے دن کہ ہم تو اس سے محض بے خبر تھے!

بقول حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ یہ تخم ہدایت کی وہ کاشت تھی جسے کل آسمانی تعلیمات کے مبداء و منتہا کا وجودِ مجمل کہنا چاہیے۔ اسکو عام فیاضی کے ساتھ نوعِ انسانی کے تمام افراد میں بکھیر دیا گیا تا کہ آئندہ ہر آدمی وحی الٰہی و الہام کی آبیاری سے اس تخم کو شجرِ ایمان و توحید کے درجہ تک پہنچا سکے۔ (۱)

قرآن نے عہدِ الست کا ذکر کیا ہی اس لیے تا کہ انسان اس کو خوب یاد رکھے اس کو اپنے راہ حیات کا چراغ اپنی منزل کا نشان اور اپنے پرکارعمل کا مرکز و محور بنائے۔

اس کی یاد تازہ ہے تو عرفانِ نفس بھی حاصل ہے اور عرفانِ رب بھی اس کی یاد ہمارا ہوش اور اس کی فراموشی ہماری بیہوشی ہے۔غور کیجئے کہ اسی عہد سے ہمیں پتہ چلا کہ

۱۔ ہماری اصل یا ہمارا وجود عبارت ہے روح سے۔

۲۔ ہمارا وطن عالم ارواح ہے جو ہماری ناسوتی حیات کی نسبت سے آخرت ہے۔

۳۔ ہماری منزل قرب الٰہی اور ہمارآبِ حیات مشاہدۂ ربانی ہے۔

۴۔ ہمارا خمیر عشق الٰہی سے اٹھایا گیا ہے (یحبهم ویحبونه) محبت الٰہی کے بغیر ہماری زندگی لفظِ بے معنی اور ذکر الٰہی کے بغیر ہمیں چین میسر نہیں آسکتا (الا بذکر الله تطمئن القلوب)

۵۔ ہمارے سفر کا مبداء و معاد یا مصدور و مرجع الست و بلی 'والا نقطہ ہے یہی انا لله وانا الیه راجعون کا حاصل بھی ہے اور عارف رومی نے اسی کی ترجمانی کی ہے:

ہر کسے کو دور ماند از اصل خویش
باز جوید روزگارِ وصل خویش

عہد الست ہی کے ذریعہ انسان توحید کا دواماً مکلّف بنا، اگر یوم الست مکلّف نہ بنتا تو اس دنیا میں آکر اس کا مامور بہ توحید رہنا ناممکن ہوجاتا اور حب الوہیت کا اقرار نہ ہوسکتا تو دنیوی اعمال پر جزا وسزا بلکہ فی نفسہ خیر وشر کی واقعی تمیز تصور سے باہر رہتی۔

مذکورہ بالا حقائق سے معلوم ہوا کہ جب تک عہدالست ہمارے انفرادی و اجتماعی، دینوی اور اخروی اعمال کا مرکز ومحور ہے اس وقت تک ہم عبداللہ، خلیفۃ اللہ اور ولی اللہ ہیں اور جہاں اس محور سے ہٹے اور جب تک ہٹے رہے ہم شرف انسانی سے گر کر کہیں کے نہ رہے۔ کاالانعام بل هم اضل کا مصداق بن گئے۔

ع ہشدار کہ راہ خود گم نہ کنی

ان حقائق کو سمجھ کر اب آیئے روح کے سفر ناسوتی کا جائزہ لیں۔ انسانِ اول یعنی حضرت آدم علیہ السلام جب وطن اصلی سے نکل کر اس زمین پر اتر آئے چونکہ وہ انسانِ اول کے ساتھ ساتھ نبیٔ اول بھی تھے، انکی روح مزکیٰ اور ان کا قلب مصفا تھا اس لیے

مادی حجابات ان کے لیے شفاف شیشے تھے، وہ مہجور وطن ہوکر بھی وطنی لذتوں سے سرشار تھے، قرب الٰہی بھی حاصل تھا اور مکالمہ ربانی سے بھی مشرف تھے، مگر ان کی ذریت جو پھیلی اور پھیلتی چلی گئی، وہ ناسوتی حجابات میں آکر اپنے وطن، وطن کی بہار، اپنی تخلیقی غایت، اپنے سفرِ حیات کے آغاز و انجام کو یکسر بھلا بیٹھی، علم سے عاری ہوکر جہل میں اور عرفان سے محروم ہوکر فریب نظری میں مبتلا ہوگئی، آدم زادوں کو ان ظلماتِ عارض سے نکال کر الست کا سبق یاد دلانے اور حقائقِ الست کو ان پر بے نقاب کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے ہادیان برحق بھیجے اور بالآخر خاتم النبینؑ، سردار الرسل محمد عربی ﷺ کو ہدایت ازلی کے اکمال و اتمام کے لیے مبعوث فرمایا۔ وہ تشریف لائے اور حیات کے دھارے پر آنکھیں بند کیے بہی جانے والی انسانیت کو چونکایا، حیات کی اس عارضی موڑ پر جس کا نام دنیا ہے رہنے اور گذر جانے کا ڈھنگ سکھایا، اپنی ذات اور اپنے طرزِ حیات کو گواہ ٹھہرا کر انہیں سفر آخرت کا شعور بخشا، فرمایا

مالی وللدنیا ما انافی الدنیا کراب استظل تحت
شجرۃ ثم راح وترکہا

مجھے دنیا (کی لذتوں راحتوں) سے کیا سروکار، دنیا میں میری مثال
اس سوار مسافر کی سی ہے جو سایہ شجر میں ستائے اور چلتا بنے۔

اور حکماً فرمایا:

کن فی الدنیا کانك غریب او عابر سبیل
دنیوی زندگی تو بس اجنبیانہ اور مسافرانہ طور پر بسر کرو!

یہ اپنی طرف سے فرمایا اور اس کے الٰہی تنبیہات بھی سنائیں مثلاً فرمایا کہ دیکھو اللہ کا ارشاد ہے

من اراد الاخرۃ وسعیٰ لها سعیها فاولیك کان
سعیهم مشکوراً (الاسراء۱۹)

جس نے (ہر اقدام میں) آخرت کی نیت رکھی اور اس کے لیے
کوشش کی جیسا کوشش کا حق ہے تو ایسے ہی لوگوں کی مساعی نگاہ حق

میں قابل قدر ٹھہریں گی

غور کیجئے کہ یہی سفر آخرت کا ہمہ وقتی شعور ہے جو مسلمان کے زہد و تقویٰ، مصیبت میں صبر راحت میں شکر، فقر میں شاہی اور شاہی میں فقر و بے نیازی کا ضامن ہے کیونکہ منزل دوست مسافر کی نظر راستہ کی تکلیف یا راحت پر کب ہوتی ہے، بقول ہمارے شیخ حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ:

ہم ایسے رہے یاں کہ ویسے رہے
وہاں دیکھنا ہے کہ کیسے رہے
حیاتِ دو روزہ کا کیا عیش و غم
سفر کا بھی کیا جیسے تیسے رہے

اس مرحلہ پر اس فرق منازل کو بھی ذہن میں لائیے کہ انسان یا تو اپنے وطن میں صرف مشاہدہ ربانی میں مگن تھا یا تاریک دنیا میں آکر ''مجاہدہ'' کا پابند کردیا گیا، امتحان میں ڈالا گیا:

الذی خلق الموت والحیاۃ لیبلوکم ایکم احسن عملاً (الملک ۲)

اسی نے موت و حیات پیدا کی تاکہ تم کو آزمائے کہ تم میں سے کون بہتر عمل کرتا ہے

جہاں روشنی تھی، مطالبۂ عمل نہ تھا۔ جب تاریکی میں گھر گئے تو مجاہدہ واجب ٹھہرا، اب بے بصر و بے خبر انسان منزل کی طرف چلے تو کیونکر چلے، اس کی اسی ہدایت کے لیے قرآن پاک اتارا گیا جو فرقان ہے کہ حق کو حق باطل کو باطل دکھلا دیتا ہے، جو نور ہے کہ راہِ آخرت کو روشن کرتا ہے، جو شفاء ہے کہ نفس کے روگ کو دور کرکے اس کے ذائقہ کو درست کرتا اور قلب کے زنگ کو چھڑا کر معرفتِ حق کے قابل بناتا ہے، جو رحمت ہے کہ دنیا کی ہر زحمت کو راحت میں بدل دیتا ہے جو ہدیٰ ہے بچھڑے ہوئے انسان کو پھر اپنے مولیٰ سے ملا دیتا ہے۔ مگر غور کی بات یہ ہے کہ یہ ربانی نظام حیات اور یہ کلام اللہ اترا

محمد رسول اللہ علیہ وسلم کے قلب اطہر ہی پر تھا، اور وہیں جمع ہوکر جب نطق نبوی سے اس کا اظہارِ انسانیت پر ہوا تو بہ ظاہر انسان کا کان اسکو سن رہا تھا مگر اسکا اثر صرف وہیں ہورہا تھا جہاں اثر پذیر دل موجود تھا خود قرآن کہہ رہا ہے۔

لمن کان لہ قلب (ق ۳۷)

ہر اس شخص کے لیے جو دل رکھتا ہو۔

یہ کیوں؟ اسکا جواب عالم ربانی علامہ ابن قیمؒ یہ دیتے ہیں کہ:

فصاحب القلب الحی بین قلبه وبین معانی القران اتم الاتصال

اس لیے کہ زندہ قلب والے کے قلب اور قرآنی معانی میں اتصالِ اتم پایا جاتا ہے۔

اور فرماتے ہیں کہ یہاں آیت پاک میں قلب سے مراد قلب بیدار ہی ہے نہ کہ دل مردہ:

والمراد به القلب الحی الذی یعقل عن اللہ کما قال اللہ تعالیٰ ان ھو الا ذکر وقران مبین لنذر من کان حیات ای فی القلب (۲)

اور یہاں قلب سے مراد زندہ قلب ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے یہ تو خالص نصیحت اور صاف پڑھی جانے والی کتاب ہے تا کہ ہر اس شخص کو ڈرائے جو زندہ ہو۔۔۔ یعنی زندہ دل رکھنے والا ہو۔

معلوم ہوا کہ اصلاً اور آخر کا ہدایت پذیری کا تعلق قلب انسانی سے ہے جو اس دنیا میں روح کی آنکھ اور اس کا حاسۂ ادراک ہے۔ ثانی طور پر اسی آیت میں اثر پذیری کی ایک صورت یہ بتلائی گئی ہے۔

او القی السمع وھو شھید (ق ۳۷)

یا جو کان دھر کر توجہ سے سنے

یہاں کان اور دھیان قلب تک ہدایت رسانی کے وسائل قرار دیے گئے ہیں

،باقی حیات اور ہدایت پذیری تمام تر قلب ہی سے متعلق ہے۔ اس لیے ہادی اعظم ﷺ نے فرمایا

الا ان فی الجسد لمضغۃ اذا صلحت صلح الجسد
کلہ واذا فسدت فسد الجسد کلہ الا وھی القلب

سن رکھو کہ انسانی جسم میں ایک لوتھڑا ہے جب وہ سدھر جاتا ہے تو
سارا جسم سدھر جاتا ہے اور جب وہ بگڑ جاتا ہے تو سارا جسم بگڑ جاتا
ہے آگاہ ہو جاؤ کہ وہ قلب ہے۔

اسی قلب کو تقویٰ کا مرکز بھی بتلایا۔ اس طرح کہ اپنے دست مبارک سے اپنے قلبِ اطہر کی طرف اشارہ کر کے فرمایا:

والتقویٰ ھھنا
تقویٰ کی جگہ یہ ہے

بہتر سے بہتر ضابطہ حیات انسان کو انسان کامل نہیں بنا سکتا جب تک کہ اس کی تنفیذ میں اندر سے باہر، قلب سے جوارح، نیت سے عمل، شعور داخلی سے ثبوت خارجی اور فرد سے اجتماع کی طرف کا اصول نہ برتا جائے، یہی تمام ہادیانِ برحق اور ہادیٔ اعظم و خاتم ﷺ کی دعوت و تبلیغ کا اصول رہا اور اسی کی پیروی ہم پر لازم قرار دی گئی۔

اب آیئے ایک اور حقیقت پر غور کریں، عالم ارواح میں گوہم قید زمان و مکان سے باہر نہیں تھے۔ مگر وہ زمانِ الٰہی سے الگ ایک زمان غیر زمانی اور مکان نامتناہی تھا نہ وہاں ماضی حال مستقبل تھا، نہ یہ شکلیں تھیں، نہ صورتیں، عملِ مشاہدہ تھا مگر بلا صورت عمل کے، مکالمہ تھا مگر بلا لسان وصوت کے مگر سفرِ حیات کی ناسوتی منزل میں روح پابند جسم ہو کر اعمال کی صورتوں کے تعین پر مجبور ہو گئی، جس کو اسلام اعمال صالحہ قرار دیتا ہے وہ بھی اس سے مستثنیٰ نہ رہ سکے گو مقصود اصلی انکی حقیقت یا روح ہی رہی مگر چونکہ اس عالم میں کوئی روح بلا قالب پائی نہیں جا سکتی اس لیے وہ قالب بھی مطلوب رہے استاذ فلسفہ صوفی صافی

بزرگ حضرت مولانا عبدالباری ندویؒ فرماتے ہیں:

''بات یہ ہے کہ کسی شے کے کمال کا تعین ہمیشہ اس کے ظاہر سے زیادہ باطن، کم سے زیادہ کیف، قشر سے زیادہ مغز یا جسم سے زیادہ جان اور صورت سے زیادہ معنی سے ہوتا ہے ـــــ جس طرح ''انسانِ کامل'' کے دو رُخ ہیں، ظاہر و باطن یا قلب و قالب، اسی طرح ''دینِ کامل'' کے بھی دو رُخ ہیں، شریعت و طریقت اور جس طرح شریعت نام ہے ظاہر یا قالب کے اعمال و احکام کا اس طرح طریقت یا تصوف نام ہے باطن یا قلب کے اعمال و احکام کا دوسرے لفظوں میں یہ کہو کہ تصوف نام ہے باطن کی فقہ کا، جس طرح نماز روزہ وغیرہ ارکان کی ایک ظاہری صورت ہے جس کے احکام فقہ میں بیان ہوئے ہیں اسی طرح خشوع وخضوع، حضور قلب یا دل سے حق تعالیٰ کی یاد و ذکر اقیم الصلوٰۃ لذکری قلب و باطن کے اعمال ہیں، جس طرح اکل وشرب، روزہ کا ظاہر ہے اسی طرح انکا باطن لعلکم تتقون ہے پھر جس طرح مختلف اعمال شرعیہ اپنی اپنی قالبی صورت رکھتے ہیں، اسی طرح ان سب کی صحت وسقم، قبول وعدم قبول کا مدار قلبی نیتوں (الاعمال بالنیات) اور درجات اخلاص پر ہے، سب سے بڑھ کر ایمان اور عقائد جن پر نجات اور ظاہر و جوارح کے سارے اعمال کی صحت وقبولیت کا مدار ہے اور جن کے بغیر نہ نماز نماز ہے اور نہ روزہ روزہ ہے وہ بالکلیہ یقین و اذعان کے قلبی و باطنی فعل ہی کا نام ہیں۔(۳)

غرض عالم ناسوت میں ہمارا وجود جس طرح روح مع الجسد کا نام ہے اسی طرح یہاں ہمارے اعمال کا اعتبار بھی مخصوص معنویتوں کے ان کے مخصوص اشکال کے ساتھ جمع ہونے ہی میں متصور ہوسکتا ہے، اسی نکتہ کو نہ سمجھنے سے مسلمانوں میں اہل ظواہر اور اہل باطن کے دو گروہ پیدا ہوئے اور دونوں حقیقت سے بیگانہ رہے، شیخ الشیوخ حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ فرماتے ہیں:

> عبادت کی روح محبت و عشق۔۔۔یہ سب جب پایا جائے گا کسی نہ کسی شخص کے ساتھ پایا جائے گا کیونکہ مطلق من حیث ہو مطلق نہیں پایا جاسکتا، کلی مرتبہ کلی میں کبھی نہیں پائی جاسکتی، جس طرح کہ انسان جب پایا جائے گا کسی نہ کسی شخص کے ضمن میں پایا جائے گا۔ اب ہم دیکھتے ہیں روحِ (عمل) یعنی توجہ الی اللہ کے جو افراد مطلوب ہیں وہ اس شخص کے ساتھ تو مطلوب نہیں جو بلاواسطہ کسی عملِ ظاہری کے ہو، کیونکہ اس میں کوئی مشقت و کلفت و مجاہدہ ہی نہیں، بلکہ مطلوب خاص وہ افراد ہیں جو ضمن میں کسی عمل ظاہری کے ہوں۔ پس اگر کوئی عمل ظاہری نہیں تو وہ شخص نہیں کلی من حیث ہو کلی کا وجود ہوتا نہیں پس وہ توجہ الی اللہ ہی نہ پائی گئی اور اگر کوئی عمل ظاہری کیا ہے تو صورت کی حاجت ہوئی تو اے مدعی وہی صورت کیوں قبول نہیں کرتا جو محبوب نے تجویز کی ہے، جب صورت سے چارہ نہیں تو صورت مجوزۂ محبوب سے اچھی کون سی صورت ہوگی؟'' (۴)

ایک اور موقع پر فرمایا:

> ''اس بات سے کون مسلمان انکار کرسکتا ہے کہ جس طرح اعمال ظاہرہ حکم خداوندی ہیں، اسی طرح اعمال باطنہ بھی حکم الٰہی ہیں۔ کیا اقیموا الصلوٰۃ واتوا الزکوٰۃ امر کا صیغہ ہے اور اصبروا

والشکروا ، امر کا صیغہ نہیں؟ کیا کتب علیکم الصیام سے روزے کی مشروعیت اور مامور بہ ہونا ثابت ہے اور والذین امنوا اشد حبا للہ سے محبت الٰہی کا مامور بہ ہونا ثابت نہیں؟ بلکہ اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ظاہری اعمال سب ہی باطن کی اصلاح کے لیے ہیں اور باطن کی صفائی مقصود و موجب نجات اور اس کی کدورت موجب ہلاکت ہے۔

قدافلح من زکھا وقد خاب من دسھا (الشمس ۱)

بے شک جس نے نفس کو صاف کیا کامیاب رہا اور جس نے اس کو میلا کیا، ناکام رہا۔

یوم لا ینفع مال ولا بنون الا من اتی اللہ بقلب سلیم (الشعراء ۸۸)

جس دن مال اور اولاد کام نہ آئیں گے بجز اس کے کہ جو شخص اللہ کے پاس قلب سلیم لے کر آئے۔

دیکھو پہلی آیت میں تزکیۂ باطن کو موجب فلاح اور دوسری میں سلامتی قلب کے بغیر مال و اولاد سب کو غیر نافع بتلایا ہے۔(۵)

غرض اس جمع اضداد دنیا میں آ کر حیات انسانی کو عام حیاتی سطح سے جو دراصل سطح حیوانی ہے ایمانی سطح پر لانے کے لیے جو دراصل روحانی ہے یا یوں کہیے آلودہ زندگی کو ''حیاتِ طیبہ'' والی منزل میں پہنچانے کے لیے ضروری ہے کہ معلم اعظم ﷺ سے بیک وقت صورت اعمال بھی حاصل کی جائے اور روحِ اعمال بھی جذب کی جائے۔ صورتِ اعمال تو قرآنی و حدیثی صراحتوں اور حضور انور ﷺ کے نمونہ اعمال سے ملیں گی، جس کا درس ہر عالمِ دین سے مل سکتا ہے۔ البتہ روحِ اعمال جو بذریعہ صحبت منجذب ہو کر منتقل ہوتی آ رہی ہے، کسی مستند صحبت یافتہ اور مجاز صحبت بزرگ ہی سے بطریق انجذاب حاصل کی جاسکتی ہے کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ ایک لاکھ سے زائد دور نبوی کے مسلمانوں کا سب

سے بڑا اشرف ''صحابیت'' ہی ہے اور اس شرف میں اس طبقۂ مقدس کے عالم و عامی، شمشیر زن اور شاعر صفہ نشین اور صاحب خلافت سب برابر ہیں، اسی فیضانِ صحبتِ نبوی نے انہیں ''احسان'' کے مرتبہ اعلیٰ تک پہنچایا تھا، ذات حق، اور جنت و دوزخ گویا انکی کھلی آنکھوں کے سامنے آگئے تھے اور ان کی وطن اصلی سے مہجوری صرف ضابطہ کی رہ گئی تھی، ظاہر و باطن کی یہ جامعیت خلفائے راشدین کے زمانہ تک برقرار رہی پھر اموی خلفاء نے شریعت کے صرف ظاہری قوانین کی تنفیذ کو اپنی ذمہ داری قرار دے کر تزکیہ نفس اور صحبت کے ذریعہ روح اعمالی کی منتقلی کے فریضہ سے دست بردار ہوگئے، اس دور کے آغاز سے ظاہر و باطن میں تفرقہ پڑ گیا، ظاہر شریعت کا نام فقہ اور باطن شریعت کا نام تصوف پڑ گیا، اموی خلفاء کے اس حال کو دیکھ کر جن حضرات نے باطنی تربیت اور فیضان صحبت کا کام سنبھالا وہ پہلے زہاد پھر عباد پھر صوفی کہلائے، اور حقیقت یہ ہے کہ پھر انہی کے ذریعہ اُمتیانِ محمدؐ کو دنیائے دار الامتحان میں عملی کامیابی حاصل ہوتی رہی، انہی نے فقیری میں شاہی کی اور بادشاہی پاکر فقیرانہ طرز حیات کے نمونے پیش کیے، کامیاب زندگی جو عبارت ہے حضور اکرم ﷺ کے جامع ظاہر و باطن اسوۂ حسنہ کی پیروی سے، اس کی تحصیل کا طرز قطب ربانی محبوب صمدانی حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی قدس سرہٗ یہ بتلاتے ہیں کہ:

کن من الله عزوجل کان لا خلق ومع الخلق
کان لا نفس فاذا لسنت مع الله عزوجل بلا خلق
وجدت وعن اکال فنیت واذا کنت مع الخلق
بلا نفس عدلت واتقیت وعن التبعات سلمت
(فتوح الغیب: مقالہ ۷۷)

اللہ کے ساتھ اس طرح رہ گویا مخلوق موجود ہی نہیں اور مخلوق کے ساتھ اس طرح رہ گویا نفس موجود ہی نہیں پس جب تو مخلوق کے بغیر اللہ کے ساتھ ہوگا تو تو اللہ کو پائے گا اور سب سے فنا ہوجائے گا اور جب تو بلانفس کے مخلوق کے ساتھ ہوگا تو تو عدل کرے گا اور

حق پر قائم رہے گا اور برے انجام سے محفوظ رہے گا۔

اسم بامسمٰی حضرت محی الدین الجمیلی قدس سرہٗ نے جو بات ارشاد فرمائی میں نے نقل کردی اور آپ نے سن لی مگر فرق یہ ہے کہ یہ عاجز یہ اطلاع پہنچا کر آپ کو اس حال کا صاحب حال نہیں بنا سکا جبکہ حضرت شیخ نے اپنی صحبت اور فیضان نظر سے اپنے مخاطبین کو اس مقام تک پہنچا کر ''انسان کامل'' بنا دیا تھا آج بھی یہ درس حاصل کرنا ہوتو وہ کسی قائد سے نہیں، معقولی سے نہیں، نرے مولوی سے بھی نہیں بلکہ کسی کامل المعرفت قوی نسبت صوفی صافی کی صحت بابرکت سے حاصل کرنا ہوگا، اس کی صحبت سے قلب کو جلاء ملے گی اس میں نور آئے گا اور پابند جسد روح پھر اس نورانی حاسہ سے الستی حقائق کو ''کانک تراہ'' پانے لگے گی، پھر یہی شخص ہوا و ہوس سے نکل کر صاحب عدل ہوگا اور کوئی دینوی تحریص اس کو ''حق'' سے ہٹا نہ سکے گی، یہی باکمال انسان ارضی خلافت کا فریضہ سرنجام دے سکے گا، دینوی اقتدار اس کو منجانب اللہ ملے گا کیونکہ اللہ پاک سے زیادہ وعدہ کا سچا کوئی نہیں اور اسکا وعدہ ہے:

ان الارض یرثھا عبادی الصلحون (الانبیاء ۱۰۵)

اس زمین کے مالک میرے نیک بندے ہوں گے۔

اور جب اقتدار خلافت کی باگ ایسے ''کامل انسان'' کے ہاتھ میں آئے گی تو دنیا اس خلیفہ کے اندر پیغمبرانہ تجلیات کا پرتو کھلی آنکھوں سے دیکھے گی۔ جیسا کہ رازدانِ حقیقت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے فرمایا:

الخلیفة من یمشی شریعة النبی فی الناس ویظمر علی یدبہ موعود اللہ لنبیہ ظھرے دار و بطنے ظھرش تمشیت است و بطنش داعیہ ایست قویہ کہ بواسطہ پیغمبر در دل او متمکن شدہ بلکہ از جذر دل او جوشہ واگر ایں داعیہ از دلِ کسے نجوشد اورا خلیفۂ خاص نمی تواں گفت۔ (۶)

''خلیفہ وہ ہے جو نبی کی شریعت کو لوگوں میں جاری کرے اور اس
کے ہاتھ پر خدا کے وہ وعدے جو اس کے نبی کے ساتھ تھے پورے
ہوں اس کی ایک ظاہری صورت ہے اور ایک باطنی، ظاہری صورت
احکام نبی کا نافذ کرنا ہے اور باطنی صورت وہ قوی داعیہ ہے جو
بواسطہ پیغمبر اسکے دل میں جاں گزیں ہو بلکہ دل کی گہرائی سے جوش
زن ہوتا ہے جس کے دل سے یہ داعیہ جوش زن نہ ہو اس کو خلیفہ
خاص نہ کہیں گے۔''

یہ ہے اسلام کے روحانی نظام کی اجمالی اطلاع، جس کی جسارت محترم و مکرم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی تحریک و اصرار پر راقم عاجز کو کرنی پڑی، ورنہ جو معلومات اوپر فراہم کی گئیں اس سے حقیقت حال کا اندازہ ہوگیا ہوگا کہ روحانی نظام قیل و قال کی چیز نہیں بلکہ یہاں عارف رومی جیسے دیدہ ور کی یہ تاکید ہے:

قال را بگذار ، مرد حال شو
پیش مردے کاملے پامال شو

نظام روحانی سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ کسی مستند صحبت یافتہ صاحب مشاہدہ بزرگ کی صحبت اختیار کی جائے، حضرت علی متقی، صاحب کنزالعمال بڑے محدث بھی ہیں اور ولی کامل بھی، وہ اپنے دریا بہ کوزہ رسالہ ''تبیین الطرق الی اللہ'' کو اس فقرہ پر ختم فرماتے ہیں۔

واما احتیاج الناس الی المرشد والاستاذ فلا بد منه
لتحصیل الطریق و سرعة الوصول واما سلوك
الطریق بغیر الرشید والاستاذ فهو فی الجمله ممکن
ممن وفقه الله بموجب قوله والذین جاهدوا فینا
لنهدینهم سلبنا یتعب شدید و مدة طویله وهو نادراً
جداً۔(۷)

''حصول طریقت اور سرعت وصول کے لیے کسی مرشد و استاد کی

حاجت ضروری ہے کیونکہ کوئی فی الجملہ بغیر مرشد و استاد کے بھی جس
کو خدا توفیق دے سلوک و طریقت میں کامیابی ہوسکتی ہے جیسا کہ
اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ”جو لوگ ہمارے لیے ہماری راہ میں کوشش
کرتے ہیں یقیناً ہم ان کو اپنے راستوں کی ہدایت عطا فرماتے
ہیں“ مگر یہ بڑے مجاہدے اور مدت دراز کے بعد ہوتا ہے اور وہ بھی
بہت ہی شاذ و نادر۔“

ظاہر ہے کہ نادر کو کلیہ کی حیثیت نہیں دی جاسکتی نہ کوئی عاقل قاعدۂ کلیہ کو چھوڑ کر مستثنیٰ کے در پے ہونا گوارا کرے گا، یہاں صحبت از بس ضروری ہے اور صحبت بھی ایسے کی جس کا سلسلۂ صحبت، صحبت نبوی تک متصل ہو، سب جانتے ہیں کہ سلسلۂ سند کا اہتمام یا تو محدثین میں ہے یا پھر شیوخ طریقت میں اور اس کی وجہ بھی ظاہر ہے کہ محدثین کرام کو یہ احتیاط ملحوظ ہے کہ اقوال رسول اللہ ﷺ غیر نبی کے اقوال کی ملاوٹ سے پاک رہیں اور شیوخ طریقت کو حزم دامن گیر ہے کہ صحبت نبوی کے فیوض ، برکات اور انوار خود ساختہ مصلحین کی کدورتوں اور ظلمتوں سے پاک رہیں۔

اب رہا یہ اشکال کہ جب یہ علم صحبتی علم ہے تو اس موضوع پر اکابر شیوخ کی اتنی کتابیں کیوں ملتی ہیں۔ اسکا صاف جواب یہ ہے کہ جن اکابر صوفیاء نے یہ کتابیں تصنیف فرمائیں وہ مدارس کے لیے تھیں ، نہ کہ عام مسلمانوں کے لیے بلکہ وہ صرف طبقۂ سالکین کے لیے تھیں تا کہ دوران مجاہدہ وسلوک انہیں جو اشکالات پیش آئیں انہیں ان میں رہبری حاصل رہے یا جو احوال و عبقات یا مشاہدہ و مکاشفات حاصل ہوں ان کی حقیقت کو سمجھ کر تصدیق یا بصورت دیگر تصحیح کی سہولت حاصل رہے، ان کتابوں پر اور ان صوفیانہ اصطلاحات پر جو زمانہ بہ زمانہ وضع ہوئیں اور برتی گئیں اصل نظام روحانی کا جو نبی اُمّی ﷺ فداہُ ابی امی کی صحبت بابرکت، فیضان نظر اور انفاس قدسیہ سے صحبتِ متواترہ کے ذریعہ ملا ہے، قطعاً دار و مدار نہیں، اسی لیے محمد غزالیؒ ہوں یا جلال رومیؒ، فخر رازی ہوں یا

برکات احمد ٹونکیؒ، ہر طالب تزکیہ و تصفیہ باطن کو یہاں اولین انتباہ یہی ملتا ہے کہ

صد کتاب و صد ورق در نار کن

سینہ را از نورِ حق گلزار کن

افسوس کہ عہد الست اور طریقت کے نا آشنا دانشور، ریسرچ اسکالرز، الٰہیات میں عقلی گھوڑے دوڑانے والے فلسفی اور تخیلات کے پتنگ اڑانے والے شاعر اور مستشرقین کے پیروؤں کے ہاتھوں میں صوفیائے کرام کی یہ کتابیں پہنچ کر عجب مضحکہ خیز رائے زنی اور رد و قبول کا شکار ہو گئی ہیں۔ ان حرف زنوں کی نہ تصدیق معتبر نہ تکذیب معتبر بلکہ آشنائے حقیقت یہ کہہ کر ان سے منہ موڑ لینے پر مجبور ہے کہ:

تو نہ دیدی گہے سلیماں را

چہ شناسی زبانِ مرغاں را

اللہ تعالیٰ ان ''قد ضلوا و اضلوا ''(۸) کے مصداق مدعیان افہام و تفہیم کے فتنہ سے اہل اسلام کو بچائے اور الستی حقائق کے متلاشیوں کو اس سے پہلے کہ ان کے ہاتھوں میں فصوص الحکم اور فتوحات مکیہ آئیں شیخ اکبرؒ کے سے کسی واقف اسرار کی صحبت میں پہنچائے، اس سے پیشتر کہ وہ مکتوبات سی صدی کو سمجھنے کی کوشش کریں شاہ شرف الدین یحییٰ منیری کی سند صحبت رکھنے والے کی خدمت میں بار عطا کرے، اس کے بجائے کہ وہ مکتوبات امام ربانی اور معارف لدنیہ اپنی فہم نارسا سے دیکھیں انہیں مجدد الف ثانیؒ والے صاحب فیض کی توجہ کا مورد بنائے، اس کے بجائے کہ وہ فیوض الحرمین اور سطعات و ہمعات کو سمجھنے کی کوشش کریں انہیں کسی وقت کے ولی اللہ کا فیضان نظر بخشے اس سے پہلے کہ کوئی مولوی صاحب قرآن کے تصور تزکیہ نفس یا تصور تقویٰ پر قلم رانی کا تہیہ کریں انہیں شاہ اشرف علی تھانویؒ جیسے صاحب نظر و خبر کی صحبت میں آ کر نور نظر اور مشاہدۂ حقیقت حاصل کرنے کی توفیق بخشے تا کہ ان کی خدمات سے ملت اسلامیہ کو قرنِ اول کا سا نفع حاصل ہو۔

ربنا لا تزغ قلوبنا بعد اذهديتنا وهب لنا من لدنك رحمة انك انت الوهاب

حواشی:

۱۔ تفسیری حواشی بر ترجمہ شیخ الہندؒ

۲۔ التفسیر القیم مرتبہ مولانا محمد اویس ندوی نگرامی

۳۔ تجدید تصوف (مطبوعہ لکھنؤ) صفحات ۴ تا ۶

۴۔ وعظ مسمیٰ بہ ''روح الارواح''، حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ

۵۔ رسالہ ''حقیقتِ تصوف'' از حضرت تھانویؒ

۶۔ ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء، جلد اول، فصل سوم

۷۔ یہ رسالہ مخطوطہ شکل میں تھا اس کی اولین اشاعت کی سعادت مولانا ڈاکٹر غلام محمد صاحبؒ کے حصہ میں آئی۔ پہلی مرتبہ یہ رسالہ ''البعث الاسلامی'' (لکھنؤ) بابتہ جولائی ۱۹۶۳ء میں چھپا۔ پھر اردو ترجمہ کے ساتھ دوبارہ اشاعت ماہنامہ بینات (کراچی) بابتہ فروری ۱۹۶۴ء میں ہوئی۔ جب اس کی ادارت حضرت مولانا کے سپرد تھی۔

۸۔ ترجمہ: ''تحقیق کہ خود بھٹکے اور دوسروں کو گمراہ کیا''۔ یہ حدیث کے الفاظ ہیں جو قیامت کے قریب پیدا ہونے والے بے بصر اہل علم اور ان کے خطرے سے بچانے کے لئے حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمائے۔

فارُوق اعظمؓ اور تصوّف

حضرت عمرؓ اور تصوف:

بظاہر عجیب سی بات معلوم ہوتی ہے ذہن کے پردہ پر یہ تصویر اصل سے کچھ مختلف نظر آتی ہے، مگر سچ مانئے قصور عکس و شبیہ کا نہیں بلکہ پردۂ ذہنی کا ہے۔ ذہن کا جھول دُور ہو، اور فکر کی سلوٹیں نکل جائیں تو آپ ہی آپ انکار اقرار میں بدل جائے گا، اس لیے پہلے ضرورت اصلاحِ فکر کی ہے۔

یہ تو سب ہی جانتے ہیں کہ حضرت عمر ابن خطاب رضی اللہ عنہ خلیفہ راشد تھے، اور ان کی حکومت خلافتِ راشدہ تھی، منہاج نبوت کے عین مطابق تھی، مگر جو لوگ یہ سب کچھ مانتے ہیں وہ یہ نہیں جانتے کہ ''خلیفہ راشد'' کون ہوتا ہے ـــــ ''خلافتِ راشدہ'' کیا ہوتی ہے ـــــ اور رہا تصوف و احسان اس کا صحیح منشاء و مفہوم تو خود عام مدعیانِ تصوف کو بھی کم ہی معلوم ہے تو اوروں کا کیا ذکر، اس لیے پہلے ان تین اصطلاحوں کا حقیقی مفہوم پیش کرنا ضروری ہے، تاکہ ظاہر بین نگاہ حقیقت کو پاسکے۔

۱۔ خلافتِ راشدہ دراصل نبوتِ محمدی کا تتمہ ہے

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کا ارشاد ہے:

> ایام خلافت بحقیقت ایام نبوت بود ولیکن وحی از آسمان فرود نمی آید
> زمانۂ خلافت زمانہ نبوت ہی تھا مگر (فرق یہ تھا کہ اب) آسمان سے وحی نہ آتی تھی۔(۱)

۲۔ خلیفۂ راشد مراتبِ ولایت کے اوجِ انتہا پر ہوتا ہے

شاہ صاحب ہی کی مستند زبان میں خلیفہ راشد وہ ہے کہ:

جو ہر نفس او شبیہ جو ہرِ نفسِ انبیاء آفریدہ باشندو ذر قوتِ عاقلہٗ اور نمونۂ وحی و دیعت نہادہ باشند و آں محدثیت است ، دور قوت عاملہٗ اونمونۂ از عصمت گذاشتہ و آں صدیقیت است و فرار شیطان از ظل اولد آنکہ استعداد نفس اوخوب الوداست تا پیغمبر ایقاظ آں نکند بیدار نہ شیود

''جس کا جوہرِ نفس انبیاء کے جوہرِ نفس کے مشابہ پیدا کیا گیا ہو اور اس کی عقلی قوت میں وحی کی مشابہت رکھی گئی ہو جو محدثیت کہلاتی ہے اور اس کی عملی قوت میں عصمت (انبیاء) کی مشابہت ہو جو صدیقیت کہلاتی ہے اور شیطان اس کے سایہ سے بھاگے البتہ یہ ضرور ہے کہ اس کے نفس میں یہ صلاحیت اس وقت تک سوئی رہتی ہے جب تک پیغمبر اس کو جگا کر بیدار نہ کردے۔''

۳۔ خلیفۂ راشد اپنے دور میں امت کا افضل ترین فرد ہوتا ہے

شاہ ولی اللہ قدس سرہٗ کے الفاظ ہیں:

از لوازمِ خلافت خاصہ آن ست کہ خلیفہ افضل است باشد در زمان خلافتِ خود عقلاً ونقلاً

''خلافتِ راشدہ کے لوازم سے ایک یہ ہے کہ خلیفہ اپنے وقت میں تمام امت سے افضل ہو عقلی اور نقلی دونوں دلائل سے۔''

۴۔ قرنِ اول میں علوم تفسیر، حدیث اور فقہ کی طرح ''تصوف'' (یا نبوی اصطلاح میں احسان) کی اصطلاحات اور اس فن کی تدوین بلاشبہ نہیں ملتی، مگر اس کی صحیح مصداقات سب وہاں موجود ہیں، اس لیے دورِ صحابہ میں لفظ و اصطلاح کو نہ پاکر ان کی اصل و حقیقت کا انکار نادانی ہے۔

۵۔ فیضانِ نبویؐ کے اثر سے صحابہ کرام کا سلوک نہایت مخفی اور بہت مختصر تھا۔اس لیے سلوک کی تفصیلات وہاں نظر نہیں آتیں مگر حاصلِ سلوک صاف طور پر وہاں دیکھا اور پایا جاسکتا ہے۔

حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہٗ ارشاد فرماتے ہیں:

اوشاں ایں نعمتِ عظمیٰ ونسبت عزیز الوجود در قدمِ اول بہ ظہوری آید

ان حضرات (صحابہؓ) پر یہ نعمتِ عظمیٰ اورنسبتِ نادرہ پہلے ہی قدم میں ظاہر ہوجاتی ہے۔

۶۔ طریقِ تصوف کا حاصل اور منتہا سیدی و سید العلماء حضرت مولانا سید سلیمان ندوی نور اللہ مرقدہٗ کی زبانِ اعجاز بیان میں ہے:

ہر عمل میں طلبِ رضا کا شعور پیدا ہونا، یہی اس طریق کا حاصل ہے اور جب خدا اور بندہ کے درمیان یہ علاقہ استوار ہو جاتا ہے تو صوفیہ کی اصطلاح میں اس کو ''نسبت'' کہتے ہیں اور قرآن پاک کی زبان میں اس کی تعبیر یحبھم و یحبونہ اور رضی اللہ عنھم و رضوا عنہ کے لفظوں میں کی گئی ہے۔یا ایتھا النفس المطمئنۃ ارجعی الیٰ ربک راضیۃ مرضیۃ انہی کے لیے نوید بشارت ہے۔(۶)

پہلے تین توضیحی مقامات سے یہ بات ذہن میں جم جانی چاہیے کہ خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروقؓ کے جتنے کمالات ظاہر و باطن ہیں ان کی اصل ان کے ''جوہر نفس'' کا کمال ان کی ''قوت عاقلہ و عاملہ کی مخصوص کسبی نہیں بلکہ وہبی استعداد ہے اور ان کی فتوحات اور ملکی نظم ونسق کے کارنامے عام حکمرانوں اور ملک گیروں سے اپنی اصل حقیقت میں بالکل الگ غیر معمولی روحانی قوت اور ربانی تائیدات کا کرشمہ تھے۔مگر اہل ظاہر کی

نگاہ اس باریکی تک نہ پہنچ سکی اور انہوں نے عمر فاروق رض کو فاتح اعظم، مصلح اعظم، ماہر نظم و نسق تسلیم کر کے گویا اعتراف عظمت کا حق ادا کر دیا حالانکہ اس سے خلافتِ راشدہ کی تقدیس اور خلیفہ راشد کے مرتبہ روحانی اور عظمتِ ایمانی کا کچھ بھی حق ادا نہ ہوا بلکہ تعریف میں تنقیص کا پہلو پیدا ہو گیا۔

ع ایں نہ مدح است او مگر آگاہ نیست

جب تک نگاہِ ایمانی میسر نہ آئے ظاہر کی یکسانیت خود مسلمان کے لیے بھی وجہ حجاب ہی بنی رہتی ہے۔

آبِ تلخ و آب شیریں ہم عناں
درمیاں شاں برزخ لایبغیاں

(رومی رح)

بہرکیف ان تین مقدمات کو سمجھنے کے بعد بقیہ چار توضیحی مقدمات کی روشنی میں تصوف و سلوک سے متعلق جو غلطیاں یا غلط فہمیاں ذہن میں تھیں وہ بھی دور ہو چکی ہوں گی اور یہ تسلیم کرنے میں کوئی تامل نہ رہ گیا ہوگا کہ حاصل تصوف یعنی ''مقامِ رضا'' میں تمکن تو دراصل حضرت عمر فاروق رض اور ان کے رفقائے مقدس ہی کا حصہ تھا اور وہی اس رتبۂ عالی کی الٰہی سند بھی رکھتے تھے —— رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ —— ورنہ اوروں کے حق میں تو یہ بات ظنِ غالب سے زائد درجہ کی نہیں۔

اسی روشنی فکر و نظر کو لیے ہوئے اب سیرت عمر رض کے خاص خاص باطنی پہلوؤں پر نظر ڈالیے تو اندازہ ہوگا کہ فاروق اعظم رض صوفی اعظم اور محسن (۷) اعظم تھے۔ ان کے جوہر نفس میں انبیاء کے جوہر نفس سے مشابہت تھی۔ وہ محدث تھے۔ یعنی مہمات امور کی فہم میں وہ عام قوت فکر یہ کے محتاج نہ تھے بلکہ اعلیٰ ترین الہاماتِ ربانیہ سے ان کی دستگیری اور رہنمائی ہوتی رہتی تھی، اور ان کے سایہ سے شیطان بھاگتا تھا۔۔۔۔ یہ سب ان کے معنوی کمالات ہی تھے جو فنِ تصوف و احسان کے تحت آتے ہیں اور انہی کا اجمالی تعارف

ہمارے موضوع کا منشا ہے۔

حضرت عمرؓ کا جوہر نفس

ہر انسان کا ''شاکلہ'' یا اس کی طبعی استعداد ایک بے مانگی عطائے ربانی ہے۔ حکمت الٰہیہ نے جس کو جو چاہا بنادیا (یخلق مایشاء) اسی وہبی استعداد کے مطابق انسانی ترقی کے منازل طے کرتا ہے۔ (کل یعمل علیٰ شاکلته) اعلیٰ سے اعلیٰ مربی بھی بس جوہر استعداد ہی کو چمکا سکتا ہے۔ نیست کو ہست کر دینا کسی کے بس کی بات نہیں۔ حضور اکرم ﷺ کا ارشاد خیارکم فی الجاهلیة خیارکم فی الاسلام (تم میں جو جاہلیت میں اچھے تھے۔ اسلام بھی اچھے ہیں) اسی رمز کا اظہار ہے۔ اس حقیقت کو نگاہ میں رکھ کر حضرت عمر فاروقؓ کی طبعی استعداد یا ان کے ''جوہر نفس'' کو دیکھئے تو آنکھیں چکا چوند ہوجائیں گی۔ اللہ اللہ کیا جوہر ہے اور کیسی استعداد کہ وحی ربانی کے چند کلمات کان میں پڑتے ہی دل میں اتر جاتے ہیں۔ رگ و پے میں بجلیاں بھر جاتی ہیں اور کائنات ہستی جاگ اٹھتی ہے ـــــ یکاد زیتها یضیٔ ولو لم تمسسه نار

(ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خود بخود جل اٹھے گا۔ اگر چہ آگ اسے نہ بھی چھوئے)

پھر یہی نہیں بلکہ بارگاہِ نبوت کی پہلی حاضری اور نگاہ نبوی کے پہلے ہی فیضان میں جوہر فاروقی کو وہ جلا ملی کہ وحی الٰہی سے کامل مناسبت اور خاص ربط دفعتہً پیدا ہوگیا۔ ان کی زبانِ حق ترجمان بن گئی اور وہ اتنے بلند ہوگئے کہ خاتم الانبیاء (علیہ الصلوٰۃ والسلام) نے ان کے جوہر نفس کی تعریف یوں فرمائی:

لو کان بعدی نبی لکان عمر بن الخطاب

میرے بعد (بالفرض) اگر کوئی نبی ہوتا تو وہ عمر بن خطاب ہوتے۔

اس کے صاف معنی یہی تو ہوئے کہ ذاتِ محمدیؐ (علیٰ صاحبها الصلوات والتحیات) پر نبوت کا ختم ہوجانا الگ بات ہے ورنہ وہ استعداد یا وہ شاکلہ اور جوہر نفس جو منصبِ نبوت

کے لیے ضروری ہے وہ یہاں موجود تھی۔ اسی شرفِ خاص کا اظہار شاہ ولی اللہ قدس سرہٗ نے یوں فرمایا کہ ـــــ جوہرِ نفس او رشبیہہ جوہرِ نفس انبیاء آفریدہ باشند۔

اہل ظاہر کا بڑا ظلم ہے کہ ان کمالات کو جو اس اعلیٰ ترین روحانی استعداد کا کرشمہ تھے۔ حضرت عمرؓ کے محض عقل و فکر کا کرشمہ سمجھتے ہیں۔ اور اپنی دانست میں ان کی تعریف کا حق بھی ادا کرتے ہیں۔

ع این نہ مدح ہست او مگر آگاہ نیست

دستِ نبوی کی جلا بخشی

جوہرِ نفس کا اندازہ کچھ ہو چکا، اب نگاہ کا رخ اس طرف کیجیے کہ یہ جوہر کن ہاتھوں سے ترش رہا ہے؟ ـــــ ہادیٔ اعظم، نبی خاتم ﷺ جن کی ایک اچٹتی نگاہ خذف کو نگیں بنادے۔ وہ عمرؓ پر توجہ فرمائیں زبانِ مبارک پر دعا ہے۔ دست پاک سے جلا بخشی ہورہی ہے۔ اور قلب فیض گنجینہ سے نور معرفت عطا ہورہا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ جو اس وقت سن شعور میں تھے۔ اپنے والد ماجد کی بارگاہِ رسالت پناہ میں اس پہلی حاضری کا ذکر یوں فرماتے ہیں:

ان رسول اللہ ﷺ ضرب صدر عمر بن الخطاب بیدہ حین اسلم ثلاث مراۃ وھو یقول اللھم اخرج مانی صدرہ من غل وبدلہ ایماناً یقول ذلک ثلاثہ

"تحقیق کہ رسول اللہ ﷺ نے عمر بن خطاب کے سینہ پر تین مرتبہ دست فیض پھیرا جب وہ اسلام لائے اور تین بار یہ دعا فرمائی کہ بارِ الٰہا اس کے سینہ میں جو کھوٹ ہو اس کو دور فرما اور اس کے بجائے ایمان بھر دے۔" (۹)

جوہر بھی بے مثل اور جوہری بھی بے نظیر، نتیجہ یہ کہ آناً فاناً جہل و ظلم گیا۔ علم و عرفان آیا، غفلت مٹی، حضوری ملی اور ذات حق سے وہ نسبت عالی اور ربط لازوال قائم ہوگیا۔ جو صحابہؓ کے زمرۂ عالی میں بھی اعلیٰ و ارفع تسلیم کیا گیا۔ شاہ ولی اللہ قدس سرہٗ کے الفاظ میں استعدادِ نفس خواب آلود تھی۔ پیغمبر کے جگانے سے جاگ اٹھی اور قوتِ عاقلہ میں جو وحی سے مشابہت ودیعت تھی اور قوتِ عاملہ میں جو عصمت سے مشابہت رکھی گئی تھی وہ اب نمایاں ہوگئی۔

زبان و قلب عمرؓ

چنانچہ اب حضرت عمرؓ کی زبانِ مبارک اور ان کا قلب اطہر اظہارِ حق کا معیار اور شناخت حق کی کسوٹی بن گیا تھا، صحابہ کرامؓ کا ارشاد ہے کہ حضور اکرم ﷺ کی موجودگی میں جب حضرت عمرؓ فاروق کچھ فرماتے یا ان کی رائے کسی جانب ہوتی تو ''قرآن حضرت عمر ہی کی رائے کے موافق نازل ہوتا'' (۱۰) خود محمد ﷺ عربی (فداہ روحی) کا ارشاد بھی اس ضمن میں یہ رہا

ان اللہ جعل الحق علٰے لسان عمر و قلبہ

اللہ تعالیٰ نے حق کو عمر کی زبان اور قلب پر موقوف فرما دیا ہے۔ (۱۱)

محدثیت یا موافقاتِ عمرؓ

علمائے ربانی نے ایسے پندرہ مواقع گنائے ہیں جن میں قرآن پاک نے بے غبار طور پر حضرت عمرؓ کی یا تو رائے (۱۲) کی تائید کی ہے یا ان کے حسبِ مراد آیت اتر آئی ہے یا لفظ بہ لفظ ان کا قول وحیٔ الٰہی بن گیا ہے جو ان کی محدثیت کی کھلی دلیل ہے۔ طوالت سے بچنے کے لیے یہاں ان تین قسم کی تائیدات یا موافقات کی صرف ایک ایک مثال ملاحظہ ہو:

۱۔رائے کی تائید

بدری قیدیوں کے متعلق صدیقِ اکبرؓ جزیہ لے کر چھوڑ دینے کا مشورہ دے رہے تھے۔ اور عمر فاروقؓ ان کے قتل پر مصر تھے۔ رحمتِ عالم ﷺ کا رجحان صدیق اکبرؓ ہی کی طرف تھا مگر وحی الٰہی جو آئی تو حضرت عمرؓ کی تائید لیے ہوئے۔ ما کان لنبی ان یکون لہ اسریٰ ـــــ ان اللہ غفور رحیم ـــــ (انفال)

۲۔مراد کی تکمیل

آیت حجاب اترنے سے پہلے کاشانہ نبوت میں ہر کوئی آتا جاتا تھا، حضرت عمرؓ کو یہ بات اچھی نہ لگی۔ حضور نبیؐ میں عرض رسا ہوئے کہ یہ سلسلہ بند فرما دیا جائے اور ازدواجِ مطہرات بھی پردے کے بغیر باہر نہ نکلا کریں نبی کریم ﷺ اس مشورہ پر حکم الٰہی کے منتظر ہو کر خاموش ہو رہے۔ ایسے میں سورۂ احزاب کی آیت حضرت عمرؓ کے حسبِ مراد اُتر آئی۔ واذا سألتموھن متاعاً فاسئلوھن من وراء حجاب

۳۔قول کی قبولیت

عبداللہ بن عباسؓ راوی ہیں کہ جب سورۂ مومنون کی آیت ولقد خلقنا الانسان من سلالۃٍ من طین نازل ہوئی تو ایک کیف عبدیت میں ڈوب کر زبانِ عمر سے بے ساختہ نکلا۔ فتبارك اللہ احسن الخالقین ـــــ اور فوراً ہی جبرئیل امین اس قول کی مقبولیت کا مژدہ لے کر نازل ہوئے۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: اے عمرؓ جو فقرہ تمہاری زبان سے نکلا تھا۔ وہی خدا نے بھی نازل فرمایا''

اللہ اکبر! کیا الہام ہے کہ وحی متلو کا شرف پایا گیا۔ یہ ہے ''وحی الٰہی سے مشابہت'' کی شان۔ اور یہ ہے ''قوت عاقلہ'' کا وہ امتیاز جو خلفائے راشدین کا امتیاز تھا۔

معرفتِ الٰہیہ

حضرت عمرؓ کی فراست و فطانت کا اعتراف اپنے پرایوں سب ہی کو ہے، اسی طرح ان کی ''اوّلیات'' (Initiatives) یعنی جن امور کی پہل کا سہرا ان کے سر ہے خواہ وہ مسائل دین سے متعلق ہوں یا تدبیر مملکت سے متعلق، ان کی فہرست بھی ایک منفرد نوعیت کی چیز ہے، سیرِ فاروقی کے اس پہلو کو اجاگر کرنے کا حق علامہ شبلی نعمانی نے خوب ادا کیا ہے۔ اس لیے اس کی تفصیل تحصیل حاصل ہے، یہاں حضرت عمر فاروقؓ کی معرفت آگاہی یا ان کے ''علم باللہ'' اور اس کی منزلتِ خاص کی طرف اشارہ مقصود ہے۔ پہلے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی جلالتِ شان کو ذہن میں رکھیے اور پھر ان کے نپے تلے الفاظ کی گہرائی تک پہنچنے کی کوشش کیجیے۔ حضرت عمرؓ کی وفات پر فرما رہے ہیں۔

> لما مات عمر انی لاحسب انہ قد ذھب بتسعۃ اعشار العلم قیل لہ نقول ھذا وفینا جملۃ من الصحابہ قال لیس اعنی العلم الذی تریدون وانما اعنی العلم باللہ تعالیٰ۔
>
> ''جب عمرؓ نے وفات پائی تو میں نے سمجھا کہ علم کا نو بٹے دسواں حصہ چلا گیا۔ لوگوں نے کہا آپ یوں کہتے ہیں حالانکہ ہم میں تمام صحابہ موجود ہیں، فرمایا علم سے جو تم مراد لیتے ہو وہ میری مراد نہیں بلکہ میری مراد ہے اللہ تعالیٰ کی معرفت کا علم''

اس سے پتہ چلا کہ یہ بات صحابہ کو بھی مسلم تھی ''علمِ معرفت الٰہی'' عام علم کتابی سے الگ ایک اعلیٰ و اشرف علم ہے اور حضرت عمرؓ اس علم معرفت کی مہر درخشندہ تھے اور یہ کہ حضرت عمرؓ کے تفقہ اور تدبیر مملکت کے کمالات ان کے اس علم معرفت سے کم رتبہ تھے، گو وہ بھی ہماری اصطلاحی عقل و فکر کے نتائج نہ تھے۔

خشیتِ الٰہی

ہم نے آخری توضیحی مقدمہ میں بتایا ہے کہ تصوف و احسان کا منتہاء مرضی عبدو مرضی حق میں یگانگت کا پیدا ہوجانا ہے اور حضرت صحابہؓ کی توصیفِ قرآن پاک نے اسی سے کی ہے کہ رضی اللہ عنھم و رضوعنہٗ ـــــ مگر خود اس ''تراضیٔ طرفین'' کو خشیتِ الٰہی کا ثمرہ قرار دیا گیا ہے ـــــ ذلك لمن خشی ربہ ـــــ اب چونکہ حضرت عمرؓ صحابہ کرام کے زمرہ میں امتیازی شان کے مالک ہیں اس لیے ان کی سیرت میں صفتِ خشیت کا ظہور بھی خاص ہی ہونا چاہیے اور ہوا۔ ان کی ایک ایک ادا خشیت الٰہی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ مگر عام طور پر اربابِ سیر نے اس پہلو کو پوری طرح نہ دیکھا نہ دکھایا اور ہمارے لیے بھی اس پورے دفتر کا کھولنا مشکل ہے البتہ ''مشتے از خروارے'' چند باتیں ہیں ان سے حضرت عمرؓ کے خوف و خشیت الٰہی کا اندازہ ہوجائے گا۔

حضرت عبداللہ بن عمر فرماتے ہیں کہ حضرت عمرؓ یوں فرمایا کرتے تھے۔

لو مات جدی بطف الضرات (ای شاطئه) لخشیت ان یحاسب الله به عمر (۱۴)

''اگر بکری کا بچہ فرات کے کنارہ پر مرجائے تو میں ڈرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اس کا محاسبہ عمر سے نہ کر بیٹھے۔''

اسی طرح عبداللہ بن عامرؓ کا قول ہے کہ میں نے حضرت عمرؓ کو دیکھا کہ زمین سے مٹھی بھر مٹی اٹھائی اور فرمایا:

لیتنی لم اخلق، لیت امی لم تلانی، لیتنی لم اکن شیئا لیتنی کنت نسیاً منسیاً (۱۵)

''کاش میں پیدا نہ ہوتا، کاش میری ماں مجھ کو نہ جنتی، کاش میں کچھ نہ ہوتا، کاش میں نیست و نابود ہوگیا ہوتا۔''

یہ ہے ایک خلیفۂ راشد اور اس امیر المومنین کے خوف و خشیت کا حال جس کے

رعب و جلال سے کائنات لرزتی تھی۔ یہ عام سلاطین اور آمروں کی مصنوعی صولت و شوکت نہیں تھی بلکہ خاص ہیبت الٰہیہ کا اثر تھا۔ جو ذاتِ عمرؓ پر چھا گئی تھی اور ظاہری حشم قدم سے بے نیاز کل ماحول کو متاثر کر رہی تھی۔ بقول عارف رومیؒ:

ہیبت حق است ایں از خلق نیست
ہیبت ایں مرد صاحب دلق نیست

بہر کیف اس خشیتِ الٰہی کی وجہ سے حضرت عمرؓ کو رات کی نیند میسر تھی نہ دن کا چین دن کو رعایا کے حقوق کا خیال نچلا نہ بیٹھنے دیتا تھا اور رات کو اپنے نفس کا محاسبہ سے نیند اچاٹ ہو جاتی تھی، خود فرماتے تھے:

اذا نمت فی اللیل صنیعت نفسی وان نمت فی النهار
صنیعت رعیتی (۱۶)

''اگر میں رات کو سو جاؤں تو میں نے اپنے نفس کو برباد کیا اور اگر
دن کو سو جاؤں تو میں نے اپنی رعایا کا نقصان کیا۔''

اس خوف سے اس قدر رویا کرتے تھے کہ عبداللہ بن عیسیٰؒ فرماتے ہیں:

کان فی وجه عمر خطان اسودان من البکاء (۱۷)
حضرت عمرؓ کے چہرہ پر آنسوؤں کے بہنے سے دو سیاہ لکیریں پڑ گئی تھیں۔''

اور خوف و خشیت کا یہ اثر کچھ وقتی نوعیت کا نہ تھا بلکہ پورے دورِ حیات پر چھایا ہوا تھا۔ حتیٰ کہ عین اس دنیا سے رخصت ہوتے ہوئے حضرت عمرؓ کو اسی کرب و بلا میں مبتلا یہ گڑگڑاتے ہوئے سنا گیا:

ویلی وویل امی ان لم یغفر اللہ لی (۱۸)
''بربادی ہے میری اور میری ماں کی اگر اللہ نے مجھ کو نہ بخشا''

یہ چند باتیں اظہار و مدعا کے لیے بس ہیں۔ تفصیل دیکھنا ہو تو سیرۃ عمر بن الخطاب ـــــ مولفہ شیخ علی الطنطاوی و ناجی الطنطاوی قابل دید ہے۔

احتسابِ نفس

خشیت کا لازمی اثر احتساب نفس ہے۔ حضرت عمرؓ کے حکام اور رعایا پر احتساب کے کارنامے بہت بیان کیے جاتے ہیں۔ مگر توجہ اس طرف بہت کم کی جاتی ہے کہ وہ خود اپنے نفس کے کتنے بڑے محتسب تھے۔ حالانکہ اپنا احتساب ہی وجہ امتیاز ہے۔ اس احتساب نفس کا صرف ایک واقعہ ملاحظہ ہو:

امیر المومنین ایک روز ممبر پر چڑھتے ہیں۔ نظر ہر آن نفس پر لگی ہوئی۔ نہ جانے کیا تغیر محسوس ہوا کہ بھرے مجمع میں اپنے نفس پر زجر کرتے ہوئے یہ فرمایا ''ایک دن وہ تھا کہ میں اپنی خالہ کی بکریاں چرایا کرتا تھا اور وہ اس کے عوض مجھے مٹھی بھر کھجور دے دیا کرتی تھیں اور آج میرا یہ زمانہ ہے۔''

بس یہ فرما کر منبر سے اتر آئے ۔حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے کہا کہ یہ تو آپؓ نے اپنی تنقیص کی۔ فرمایا تنہائی میں میرے دل نے کہا کہ تم امیر المومنین ہو، تم سے افضل کون ہوسکتا ہے۔ اس لیے میں نے چاہا کہ اس کو اپنی حقیقت بتا دوں''(۱۹)

اظہارِ نعمت یا شکرانۂ فضیلت

اس احتساب کے ساتھ اگر کسی عطائے ربانی کا اظہار کیا جائے تو وہ '' فـامـا بنعمت ربك فحدث '' کے امر ربانی کی محض تعمیل ہے۔ اس نزاکت کو بجز ماہرین فن تصوف کے نہ کوئی جان سکتا ہے نہ پہچان سکتا ہے۔ اظہارِ فخر کیا ہے اور تحدیث نعمت کیا ہے؟ حالانکہ ایک میں بندہ کی ہلاکت ہے اور دوسرے میں نعمت کی حفاظت بلکہ اس کے ازدیاد کا سامان ـــــ عمر فاروقؓ کے احتساب نفس کا حال دیکھتے ہوئے یہ بڑی سوئے ادبی ہوگی اگر ان کے کسی اظہارِ نعمت کو عام سلاطین کے اظہار فخر وغرور پر محمول کیا جائے البتہ کوشش اس بات کی ہونی چاہیے کہ وہ رمز معلوم ہوجائے، جو اس اظہارِ عام میں پوشیدہ ہے۔

دیکھئے حضرت عمرؓ تختِ خلافت پر آچکے ہیں اور صحابہ کرامؓ کے مقدس مجمع سے مخاطب ہیں۔ اپنی اس فضیلتِ خداداد کا شکرانہ اور خلافتِ راشدہ کے مقام و منصب کا اظہار کس قدر صاف صریح الفاظ میں فرما رہے ہیں

الحمد لله الذی سیرانی بحیث لیس فوقی احد(۲۰)

''اس خدا کی تعریف جس نے مجھے ایسا بنا دیا کہ آج مجھ سے برتر کوئی نہیں۔''

اس اظہارِ "لیس فوقی احد" کو سن کر سب سرِ تسلیم خم کیے ہوئے ہیں اور سب کے سب حضرت عمرؓ کی ظاہری و معنوی، قالبی و قلبی، حکومتی اور روحانی فضیلت پر مہر تصدیق ثبت کر رہے ہیں۔ ورنہ اس مجمع مقدس کا ایک ایک فردِ حق کے معاملہ میں اس قدر بیباک تھا کہ فوراً ٹوک دیتا کہ اے عمر! تمہاری ظاہری برتری مسلم، مگر باطنی پیشوائی کو ہم تسلیم نہیں کرتے، مگر جب کسی ایک نے بھی ایسا نہیں کیا تو اپنے دور میں حضرت عمرؓ کی فضیلت ہر اعتبار سے ثابت ہوگئی۔ اور معلوم ہوا کہ ان کے دورِ خلافت میں قسامِ ازل اپنی عطا کی تقسیم انہیں کے ہاتھوں کروا رہا تھا خواہ وہ مالِ غنیمت ہو یا انوار ولایت ہوں۔ اسی جامعیت کمال کی طرف شاہ ولی اللہ قدس سرہٗ نے ان الفاظ میں ارشاد فرمایا کہ:

''از لوازم خلافت خاصہ آں ست کہ خلیفہ افضل امت باشد درزمانِ خلافتِ خود۔''

فرارِ شیطان

حضرت شاہ ولی اللہؒ نے خلیفۂ راشد کے روحانی کمالات کے ضمن میں یہ بھی فرمایا ہے کہ " فرارِ شیطان از ظلِ او"

خلیفہ ثانی حضرت عمرؓ کے متعلق تو ان کے اس وصف کی تصدیق خود تعلقِ نبوی سے حاصل ہے۔

حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

یا عمر ما لقیك الشیطان سالكا فجا الا سلك فجا غیر فجك

اے عمر جب شیطان تم سے کسی راستہ میں ملتا ہے تو اپنا راستہ بدل دیتا ہے۔

اس کے صاف معنی یہی ہوئے کہ مظہرِ ہدایت کے سامنے مظہر ضلالت کی کیا مجال ہے کہ ٹھہر سکے اور یہی بات ہم پورے زور وقوت سے ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ کا یہ روحانی ترفع ہے کہ وہ ''ہدایتِ ربانی'' کے مظہر بن گئے تھے۔ اس لیے ان سے ہدایت ہی ہدایت پھیلتی رہی اہل ظاہر کی نظر فاروقی کارناموں پر تو کچھ ہے بھی مگر نفس فاروقیت پر بالکل نہیں۔

اصطلاح ومحاورہ تصوف میں چند باتیں

اب تک ہم نے حتیٰ الامکان اصطلاح اور محاورہ فن سے بچتے ہوئے سیرتِ فاروقی میں تصوف کے حقائق کی نشاندہی کی ہے۔ اب کچھ اصطلاح میں گفتگو کرنا ہے۔

حضرت عمر ''مرادؔ'' ہیں

اہل ظاہر کے نزدیک تو حضرت عمرؓ کا امتیاز ان کے دورِ خلافت پر منحصر ہے مگر ان کے امتیاز کو قبلِ خلافت ہی نہیں بلکہ ان کے اصل جوہر اور ان کی ابتدا میں دیکھتی ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ وہ اسلام میں ''مرید'' ہو کر نہیں آئے بلکہ مرادؔ ''بن کر آئے ہیں۔ ان کو حضور پاک ﷺ کی دعا نے کھینچا ہے حضور نے ان کو اللہ تعالیٰ سے یہ کہہ کر مانگا تھا۔

اللهم اعز الاسلام باحب هذين المرجلين اليك بابى جهل و عمر بن الخطاب (۲۱)

''اے اللہ ابوجہل اور عمر بن خطاب میں سے جو تجھے محبوب ہو اس سے اسلام کو عزت عطا فرما۔''

چنانچہ جب اس دعا قبولیت نے ظہور کیا اور نگاہِ رب العزت میں عمر بن خطاب ہی محبوب ٹھہرے اور انہی کے ذریعہ دین کی عزت افزائی مقدر ٹھہری، تو ابن ماجہ کی روایت ہے کہ حضرت عمرؓ کے حلقہ بگوش اسلام ہونے پر جبریل علیہ السلام آئے اور بارگاہِ نبوت میں

عرض کی کہ: آسمان کے لوگ آپ کو عمر کے اسلام لانے پر بشارت دیتے ہیں۔ ''مرادیت عمر'' کی یہ کس قدر کھلی اور مستحکم دلیل ہے۔

حضرت عمرؓ مجذوب سالک ہیں

فن تصوف وسلوک کے واقف کار جانتے ہیں کہ جو ''مراد'' ہوتا ہے اس کو دولتِ جذب پہلے ملتی ہے اور مدارج سلوک کی سیر بعد میں کرائی جاتی ہے۔ یہی ''حجیت'' کی نشانی ہے۔ اور اسی کو اصطلاح میں ''مجذوب سالک'' کہا جاتا ہے لہذا حضرت عمرؓ بھی مجذوب سالک ہوئے۔ چنانچہ حضرت مجدد الف ثانیؒ نے پوری صراحت سے تحریر فرمایا ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ تو ''سالک مجذوب ہیں (۲۲) مگر بقیہ تینوں خلفاء کا حال یہ ہے کہ:

فان جذبهم مقدمه على سلوكهم كما هو حال حضرة الرسالة المصطفويه عليه وعلى الله الصلوات والتسليمات (معارف لدنی۔ معرفة ۲۲)

''یعنی ان حضرات (ثلثہ) کا جذبہ ان کے سلوک پر اسی طرح مقدم ہے جیسے خود حضرت رسالۃ پناہ علیہ ﷺ کا حال ہے۔''

اور ''سالک مجذوب'' کے متعلق حضرت کا یہ ارشاد ہے کہ وہ مجذوب سالک سے معرفت میں بڑھا ہوا ہے۔ مگر اس معرفت میں جو مقامات عشرہ زہد توکل، صبر رضا وغیرہ سے متعلق ہے۔ البتہ ''مجذوب سالک'' حجت میں ''سالک مجذوب'' سے بڑھا ہوا ہے اور ذات و صفاتِ الٰہی کی معرفت اس کو زیادہ حاصل ہوتی ہے۔ یہ حاصل ہے معارف لدنیہ کی معرفت ۲۳ کا اور اس سے اصحابِ ثلثہ کی فضیلت حضرت علی کرم اللہ وجہہ پر ثابت فرمائی گئی ہے ــــ حضرت مجدد الف ثانیؒ کی یہ بات متفق علیہ نہیں ہے۔

اکابر متقدمین حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو ولایت میں (جو معرفتِ الٰہی کے شعبہ کا

نام ہے) افضل اور فائق تر سمجھتے ہیں اور حضرت شیخ اکبرؒ تو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو خاتم الولایت'' مانتے ہیں (دیکھئے الحل الاقوام ہماری کیا مجال کہ اکابر اہل اللہ کے اس اختلاف میں حکم بننے کی جرأت کریں۔ البتہ اس سلسلہ میں اپنے ایک بزرگ عالم و عارف حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ کا قول بہت صاف اور دل لگتا ہے۔

فرماتے ہیں کہ قدرت نے عورتوں میں ایک (یعنی حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا) اور مردوں سے ایک (یعنی حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ) کو نبوی تربیت کے لیے خاص کرلیا تھا۔ ان دونوں نے ابتدائے شعور ہی سے نبوی تجلیات میں پرورش پائی اور ان کے دل و دماغ غیر نبوی اثرات سے ہمیشہ محفوظ رہے۔ یہ منفرد فضیلت عورتوں میں حضرت عائشہؓ اور مردوں میں سے حضرت علی کرم اللہ وجہہ ہی کو حاصل تھی۔

حضرت عمر ''قدمِ موسیٰ'' پر

یہ تو سب ہی مانتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کی ذاتِ اقدس کو ابراہیمیت، موسویت اور عیسویت —— غرض —— آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری —— والی جامعیت کا خاص شرف حاصل ہے البتہ حضورِ اقدس ہی کے فیضان روحانی سے پچھلے انبیاء کی طرح اگلے اولیاء کاملین میں بھی کسی میں حضرت نوح علیہ السلام والے غیظ و غضب کا جلال کسی میں موسوی حکومت و سطوت کا شکوہ کسی میں عیسوی زہد و عفو کا جمال نمایاں دیکھا جاسکتا ہے۔ صوفیاء کرام اپنی بولی میں افراد امت محمدیہ کے ان شیون کی تعبیر اس طرح کرتے ہیں کہ فلاں بزرگ ''قدم نوح'' پر ہیں۔ فلاں ''قدمِ موسیٰ پر اور فلاں قدم عیسیٰ'' پر صوفیاء کے اس نقطہ نظر سے سیرتِ عمرؓ کا جائزہ لیا جائے تو اس میں یہ تمام خشیت و زہد، تنظیم ملت، حکومت سطوت اور بادہ و جلال کی خصوصیات اس قدر نمایاں نظر آتی ہیں کہ ہم بلا پس و پیش یہ کہہ سکتے ہیں کہ فاروق اعظم ''قدمِ موسیٰ'' پر ہیں۔۔۔ اور یہ بات کم از کم حضرات شیخینؓ اور حضرت عبداللہ بن رواحہؓ کے بارے میں تو محض صوفیا کے کہنے کی نہیں ہے۔ بلکہ

نطق نبوی سے اس کی کھلی تائید مل جاتی ہے دیکھئے غزوہ بدر میں جب کفار قریش گرفتار ہو کر آئے۔ تو آنحضرت ﷺ نے صحابہؓ سے مشورہ طلب کیا۔ حضرت عبداللہ بن رواحہؓ نے کہا کہ ان کو آگ میں جلادیا جائے۔ اور حضرت عمرؓ نے کہا کہ ان کو قتل کردیا جائے۔ لیکن حضرت ابوبکرؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ یہ آپ کے خاندان اور قوم کے ہیں۔ ان پر رحم فرمایئے آپؐ نے ان دونوں فریقوں کے مشورے سن کر فرمایا کہ ایک فریق اپنے پہلے بھائیوں نوحؑ کی طرح ہے۔ نوحؑ نے کہا پروردگار زمین پر کافروں میں سے کسی گھر بسانے ''والے کو مت چھوڑ اور موسیٰؑ نے کہا ہمارے پروردگار ان کی دولت سمیٹ دے اور ان کے دلوں کو سخت کردے۔ اور دوسرا فریق ابراہیمؑ کی طرح ہے۔ ابراہیمؑ نے کہا جس نے میری پیروی کی وہ مجھ سے ہے اور جس نے نافرمانی کی تو تو بخشنے والا ہے اور رحم کرنے والا ہے۔ اور عیسیٰ کی طرح ہے، کہ عیسیٰ نے کہا اگر تو ان کو سزا دے تو وہ تیرے بندے ہیں اور تو معاف کردے تو تو قدرت والا اور حکمت والا ہے۔ (مستدرک حاکم3، 21-22) اس سے معلوم ہوا کہ آپ نے عبداللہ بن رواحہؓ اور حضرت عمرؓ کو حضرت نوحؑ اور حضرت موسیٰؑ کی نذیری شان اور حضرت ابوبکرؓ کو حضرت ابراہیم اور حضرت عیسیٰ کی بشیری شان کی مثال میں ظاہر فرمایا۔' (۲۴)'

حضرت گنج مراد آبادیؒ کی تصدیق

قطب آفاق حضرت شاہ فضل الرحمٰن گنج مراد آبادیؒ نے جو اعلیٰ روحانی و عرفانی منزلت کے حامل ہونے کے علاوہ اتنے بڑے محدث تھے کہ محدث کبیر حضرت مولانا احمد علی سہارنپوریؒ نے ان کو بخاری شریف استفادہ کی غرض سے سنائی تھی۔ حضرت موصوف کا بھی یہی ارشاد ہے کہ:

''بزرگانِ قادریہ میں ''نسبت فاروقی'' کا ظہور ہے۔ اور نسبت حضرت فاروق اعظمؓ کی موسوی ہے۔ اسی سے جلالِ الٰہی اور تصرفات عظیم الشان کا ظہور حضرت غوثِ اعظمؒ سے

بہت ہوا۔ اور قربِ شہادت میں بڑا درجہ پایا۔ (۲۴)

مجدد الف ثانیؒ کا عجیب انکشاف حضرت عمرؓ ''قطب ابدال'' تھے

حضرت عمرؓ کا قدم موسیٰؑ پر ہونا ثابت ہو چکا اور یوں بھی چشمِ بصیرت پر ظاہر ہی تھا۔ لیکن اگر سوال یہ کیا جائے کہ خود نبی اکرم ﷺ کی حیاتِ مبارکہ میں آپ کا روحانی مقام کیا تھا، تو اس کا جواب حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہٗ سے ملے گا۔ اپنے مشہور رسالہ ''معارف لدنیہ'' میں معرفت ۳۵ کے تحت حضرت مجدد نے پہلے تو ''قطب ارشاد'' اور ''قطب ابدال'' کے فرق کو واضح فرمایا ہے کہ ایمان، ہدایت، نیکیوں کی توفیق، برائیوں سے توبہ، یہ ''قطب ارشاد'' کے فیوض کا نتیجہ ہیں اور ''قطب ارشاد'' قدم نبوی ہوتا ہے۔ اس کے بالمقابل ''قطب ابدال'' دنیا کے تکوینی امور جیسے بلاؤں کا ازالہ، امراض کا خاتمہ، حصولِ عافیت اور رزق رسانی وغیرہ کا ذریعہ ہوتا ہے اور اس کو پل کی فرصت نہیں ہوتی بلکہ ہمیشہ مشغول ہی رہتا ہے۔۔۔ اس فرق کی وضاحت کے بعد دورِ حضرت رسالت پناہؐ میں عمر فاروقؓ کے مقامِ باطنی سے متعلق یہ عجب انکشاف فرمایا ہے:

> وقد کان رضی اللہ علیہ وسلم قطب الارشاد و کان قطب الابدال فی ذلک الوقت عمرؓ و اویس القرنیؓ
>
> خود حضور ﷺ تو قطب ارشاد تھے اور اسی دور میں عمرؓ اور اویس قرنیؓ قطب ابدال تھے۔

تجدید دین کا کارنامہ ''نسبتِ فاروقی'' کے ذریعہ انجام پاتا ہے

رد و قبول اہل بصیرت پر چھوڑتے ہوئے مکتب تصوف و احسان کے ابجد خوان کی حیثیت میں نسبت فاروقی سے متعلق ایک غور طلب بات پیش کرنے کو جی چاہتا ہے اور وہ یہ ہے کہ ہر نسبت کا ایک لون (رنگ) ہوتا ہے، اور جب کبھی کسی خاص نسبت کا ظہور

کہیں ہوتا ہے تو اس صاحبِ نسبت سے اسی رنگ کے مخصوص کمالات ظاہر ہوتے ہیں اور نسبتوں کے ان الوان کے اشارات خود احادیث نبویہ سے ملتے ہیں۔ مثلاً حضرات نقشبندیہ جو نسبتِ صدیقی کے حامل ہیں ان میں سینہ بہ سینہ القا کا ظہور زیادہ ہے۔ اس کا اشارہ اس ارشاد نبوی میں صاف ملتا ہے کہ

ماصب اللہ صدری شیاءً الا صبتہ فی صدر ابوبکرؓ
اللہ تعالیٰ نے میرے سینہ میں کوئی بات ایسی نہیں ڈالی جو میں نے
ابوبکرؓ کے سینہ میں ڈال نہ دی ہو۔

یا مثلاً حضراتِ چشتیہ جو نسبتِ علوی کے حامل ہیں ان میں فنائیت کا کمال بہت زیادہ ہے، یہ فیضِ عینیت کا اثر ہے جس کا اشارہ اس حدیثِ پاک میں ملتا ہے کہ:

علی منی و انا منہ
علی مجھ سے ہے اور میں علی سے ہوں۔

اسی طرح اگر غور کیا جائے تو فاروقِ اعظمؓ کے بارے میں جو خاص ارشادِ نبوی ہے وہ یہ ہے کہ:

لو کان بعدی نبیاً لکان عمر
میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو وہ عمر ہوتے۔

اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ نظامِ شرعی کی ترویج و تجدید کے کارنامے کا خصوصی تعلق ''نسبتِ فاروقی'' ہی سے ہے اور جب کبھی ''نسبتِ فاروقی'' کا فیضانِ خاص کسی ولی پر غالب آتا ہے تو اس سے تجدید دین کا کارنامہ سرانجام پاتا ہے خواہ وہ کہنے کو نقشبندی ہو یا چشتی یا قادری یا سہروردی۔ (۲۵)

اس حقیقت کے ماسوا تاریخ مجددین پر سرسری نظر ڈالئے تو ''اتفاق مشیت'' کا ایک اور کرشمہ نظر آئے گا۔ وہ یہ کہ دین محمدی کے مجدد اول اور پانچویں خلیفہ راشد عمر بن عبدالعزیزؒ ہیں جو نسبتِ باطنی رکھنے کے علاوہ فاروقِ اعظمؓ کے پڑپوتے تھے۔ پھر ہزارۂ ثانی کے بعد مجدد اول حضرت شیخ احمد سرہندی قدس سرہٗ جن کا نام نامی ہی ''مجدد الف

ثانی'' پڑ گیا ہے۔وہ بھی فاروقی النسب ہی ہیں۔بارہویں صدی کے مجددِ کبیر حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی قدس سرہٗ بھی نسباً فاروقی ہی تھے۔ اسی طرح چودھویں صدی میں دین محمدیؐ کے ایک اور ممتاز مجدد یعنی حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ بھی نسباً فاروقی ہی ہیں۔ان چار ہستیوں کے علاوہ درمیانی صدیوں کے مجددین کی جو فہرستیں امام جلال الدین سیوطیؒ یا اور محدثین نے مرتب فرمائی ہیں۔ ان میں سے ایک ایک کو دیکھا جائے تو اور بھی ہستیاں ایسی نکل آئیں گی جن میں فاروقی خون جوش زن ملے گا۔ گو ہمارے نزدیک تجدیدی کارنامہ کا انحصار نسب پر نہیں بلکہ محض ''نسبت فاروقی'' ہی کے زور پر ہے۔

حواشی

۱۔ ازالۃ الخفاء عن خلافت الخلفا فصل دوم

۲۔ ازالۃ الخفاء فصل سوم

۳۔ محدثیت سے مراد فہم کی وہ اعلیٰ استعداد ہے جس میں عام قوت فکریہ کی محتاجی نہ رہے۔

۴۔ ازالۃ الخفا فصل دوم، حضرت شاہ صاحبؒ نے قرآن، حدیث، عمل نبوی اور تعامل صحابہؓ سے بھی اور بے شمار عقلی دلائل سے بھی اس دعویٰ کو ثابت کیا ہے۔ تفصیل کے لیے اصل کتاب دیکھنی چاہیے۔

۵۔ مکتوب ۳۲ دفتر اوّل مکتوبات مجدد الف ثانیؒ

۶۔ مکاتیب سلیمان، مرتبہ مولانا مسعود عالم مرحوم

۷۔ ''محسن'' قرآنی و حدیثی اصطلاح میں نہ کہ ہماری زبان کے محاورہ میں۔

۸۔ ترمذی بروایت عبداللہ بن عمرؓ

۹۔ الاستیعاب ۲:۴۶۲

۱۰۔۱۱۔۱۲۔ مشکوٰۃ المصابیح باب مناقب صحابہؓ فصل ثانی

۱۳۔ ابن الجوزی۔ سیرت عمرؓ

۱۴۔۱۵۔ سیرت عمر بن الخطاب از علی طنطاوی بحوالہ ابن الجوزی ۱۴۰ والریاض النفرہ ۲:۴۵

۱۶۔ سیرۃ عمر بن الخطاب از علی طنطاوی بحوالہ تنبیہ المفترین المشعرانی ۴۸

۱۷۔ ایضاً بحوالہ ۱:۵

۱۸۔ ابن الجوزی، سیرت عمرؓ ۱۹۶

۱۹۔ نزھت الابرار، تذکرۂ حضرت عمرؓ

۲۰۔ ارشاد الطالبین مصنفہ حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ بحوالہ دیلمی در فردوس و ابونعیم در حلیہ

۲۱۔ ترمذی بروایت عبداللہ بن عمرؓ

۲۲۔ اور ''سالک مجذوب'' کے متعلق حضرت کا یہ ارشاد ہے کہ وہ مجذوب سالک سے معرفت میں بڑھا ہوا ہے۔ مگر اس معرفت میں جو مقامات عشرہ زہد توکل، صبر، رضا وغیرہ سے متعلق ہے......البتہ ''مجذوب سالک'' حجت میں ''سالک مجذوب سے بڑھا ہوا ہے اور ذات و صفات الٰہی کی معرفت اس کو زیادہ حاصل ہوتی ہے۔

۲۳۔ خلیل اللہ کی بشریت......حضرات انبیاء علیہم السلام کے اوصاف عالیہ'' از علامہ فہامہ مولانا سید سلیمان ندویؒ یہ مقالہ مضامین سید سلیمان ندوی حصہ اوّل میں شریک ہے۔

۲۴۔ کمالات رحمانی مرتبہ حضرت مولانا شاہ تجمل حسینؒ

کیا وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود نزاعِ لفظی ہے؟

گیارہویں صدی ہجری سے وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود کا مسئلہ اہل علم وعرفان کا مرکز توجہ بنا رہا ہے اور اس موضوع پر قابل قدر تصانیت معرض وجود میں آئی ہیں ان تصانیف سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہر دور میں اس مسئلہ سے متعلق دو رائیں چلی آرہی ہیں۔ ایک یہ کہ وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود نا قابل تطبیق دو الگ الگ نظریات ہیں۔ دوسرے یہ کہ ان میں اختلاف حقیقی نوعیت کا نہیں بلکہ لفظی نزاع نے ان کو الگ الگ نظریات کی شکل دے دی ہے اور ان میں تطبیق پیدا کی جاسکتی ہے۔ یہاں انہی نقطہ ہائے نظر کا احتیاط سے جائزہ لیتے ہوئے صحیح صورت حال تک پہنچنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

نظریۂ وحدۃ الوجود کی اصل، خواہ بقول شاہ رفیع الدین دہلویؒ قرنِ اول میں بھی ملتی ہو(۱)۔ مگر اس کو ایک مرتب نظریہ بنا کر علمی دلائل، کشفی یافت اور تائید و تاکید غیبی (۲) کے ساتھ پیش کرنے کا سہرا الشیخ الاکبر محی الدین محمد بن علی بن محمد العربی الطائی الحاتمی (ف ۶۳۸ھ) قدس سرہٗ کے سر ہے، جس کو انہوں نے اپنی معرکتہ الآرادقیق تصنیف فصوص الحکم میں پیش فرمایا، اور اسکی تشریحات اپنی دوسری ضخیم تصنیف فتوحات مکیہ میں بھی تحریر فرمائی ہیں۔

حضرت شیخ اکبر کا نظریہ فی الجملہ تصوف کے تمام سلاسل بشمول نقشبندیہ (۳) میں مسلم رہا ہے بلاشبہ شیخ علاء الدین سمنانی یا حضرت سید محمد گیسو دراز (ف 825ھ) جیسے بعض مسلم شیوخ نے نظریۂ وحدۃ الوجود سے اختلاف فرمایا مگر ان بزرگوں کے اختلاف کی نوعیت شخصی رائے کی رہی، ان میں سے کسی نے بھی شیخ اکبرؒ کے مقابل کوئی نظریہ تصوف

پیش نہیں فرمایا۔ البتہ گیارہویں صدی کے اوائل یعنی ۱۰۱۱ھ میں جب امام ربانی شیخ احمد فاروقی سرہندی قدس سرہٗ ''خلعتِ مجددیت'' سے سرفراز ہوکر اصلاح ملت کے منصب پر فائز ہوئے۔(۴)۔ اور حضرت ممدوح کو اپنے اطراف نام نہاد صوفیوں کا پیدا کردہ زندقہ کا وہ ماحول ملا جس میں شیخ اکبر قدس سرہٖ کے وجودی فلسفہ اور ان کی اصطلاحات کی غلط تاویلات کے ذریعہ ویدانتی فلسفہ کی پورے زور و شور سے تلقین کی جارہی تھی اور بڑی بے باکی سے کاشانۂ شریعت کی اینٹ سے اینٹ بجادی گئی تھی تو ایسے ناقابل برداشت ماحول میں شریعت محمدیہ کی تجدید، عقائد حقّہ کی ترویج اور صحیح دینی روح بحال کرنے کے لیے۔ حضرت مجدد قدس سرہٗ نے شیخ اکبر قدس سرہٗ کے نظریہ وحدۃ الوجود کی تردید فرماتے ہوئے نظریہ وحدۃ الشہود اور شیخ کے فلسفہ اعیان ثابتہ کے مقابلہ میں اپنا فلسفہ ظلال وعکوس اور شیخ کی اختیار فرمودہ اصطلاحات کے متبادل اصطلاحات پیش فرمائیں۔ یوں گیارہویں صدی ہجری سے دو مستقل نظریے منظر عام پر آئے اور پھر ان کے رد و قبول یا ان میں باہمی تطبیق و مصالحت کی مساعی کا آغاز ہوا اور چوٹی کے علمائے ربانی نے اس میں حصہ لیا ہے۔

تمہید بالا سے ظاہر ہے کہ موضوعِ بحث نازک اور دقیق ہے اور اس پر گفتگو علم، ذوق، نظر اور انشراح صدر کی طالب ہے اس لیے مجھ ہیچمیرز کی لب کشائی بے باکی اور مجھ محجوب کا اظہارِ خیال سوئے ادب سمجھا جا سکتا ہے مگر میری آنکھوں کا سرمہ چونکہ انہی بزرگوں کی گرد راہ ہے اس لیے میری معروضات اس پہلو سے اعتنا کی مستحق ہیں کہ۔

گاہ باشد کہ کودکِ ناداں
از غلط برہدف زند تیرے

وجود و شہود کا تقابل صحیح نہیں

احقر نے وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود کے نظریات میں علمی راہ سے جتنا غور کیا اور اپنے عالی نسبت، قوی التاثیر پیر و مرشد کے فیضان توجہ و تربیت سے نیز بعض اور مشائخ

کے الطافِ کریمانہ سے ان حقائق کو عملاً جس درجہ میں سمجھ سکا تو یہ حقیقت انشراح صدر کے ساتھ سامنے آئی کہ فی نفسہٖ وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود کا تقابل نہ علمی پہلو سے صحیح ہے نہ درجہ حال کے اعتبار سے درست ہے، علمی اعتبار سے تو یوں صحیح نہیں کہ وحدۃ الوجود ربط خالق ومخلوق کی تعبیر ہے در آں حالیکہ وحدۃ الشہود کا اس سے دور کا بھی واسطہ نہیں، وہ تو توحیدی غلبہ حال میں سالک طریق کی ایک دید ہے ایک مرحلہ ہے، ایک کیفیت ہے، لہٰذا دو مختلف الاصل حقیقتوں کا تقابل کیسے صحیح ہوسکتا ہے۔۔ حضرت شیخ اکبرؒ کے نظریہ وحدۃ الوجود کا تقابل اگر کرنا ہی ہو تو وہ حضرت مجدد الف ثانیؒ کے نظریہ ظلال وعکوس سے ہوسکتا ہے جو ربط خالق ومخلوق کی دوسری تعبیر ہے، مگر عام طور پر نظریہ ظلال کی واقفیت خود مجددی سلسلہ کے شیوخ میں ناپید ہے۔

رہا یہ سوال کہ پھر عموماً وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود کا تقابل کیسے ہوتا چلا آرہا ہے؟ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وحدۃ الوجود نہ صرف ربطِ خالق وخلق کی تعبیر عرفانی ہے بلکہ یہ سالک طریق کا حال بن کر بھی مشاہد ہوتا ہے۔(۵)۔ اور اس میں شاہد ومشہود کا امتیاز تک باقی نہیں رہتا جبکہ شہودی حال میں باقی رہتا ہے۔ اس وجودی حال اور شہودی حال میں تقابلی گفتگو ہوسکتی ہے چنانچہ مکتوباتِ امام ربانی میں اس حیثیت کا تقابل اور موازنہ موجود ہے۔ مگر اس پہلو سے عجیب بات یہ مشاہدہ میں آتی ہے کہ بعد والوں نے گو اس کو اختلافی حیثیت دے کر ایک تردید اور دوسرے کا اثبات کیا ہو مگر خود حضرت مجددؒ کو یہاں شیخ اکبرؒ سے کوئی اختلاف نہیں بلکہ وہ وجودی حال کی تائید فرماتے ہوئے مزید مراتب ترقی کا ذکر فرماتے ہیں مکتوبات امام ربانی جلد دوم کا مکتوب نمبر ۴۲ جو دس صفحات پر پھیلا ہوا ہے اس میں حضرت مجددؒ کا صاف وصریح ارشاد ہے:

> خلاف ایں فقیر با ایشاناں درایں امور
> از راہ کشف و شہود است ، علماء
> بہ قبح ایں امور قائل اند و ایں فقیر
> بہ حسنِ ایں امور بشرط عبور!

اس فقیر کا ان حضرات (وجود یہ) سے اختلاف کشف وشہود کی راہ سے ہے علماء ان امور کی قباحت کے قائل ہیں اور یہ فقیر ان کے حسن (صحت) کا قائل ہے بشرطیکہ اس سے عبور (ترقی) مانا جائے۔ (۶)

پر زور تصریح یوں فرمائی گئی ہے:

اینجا باطل چیست و بطلاں کجا دریں موطن استیلائے حق است وبطلان باطل!

یہاں باطل کیا ہے اور بطلان کی گنجائش کہاں اس منزل میں ذاتِ حق کا غلبہ ہے اور اسکا بطلان (تردید) خود باطل ہے۔

حضرت مجدد قدس سرہٗ کی اس غیر مبہم تصریح و تنبیہ کے بعد مسئلہ وجود وشہود میں شورِ اختلاف کی کیا اہمیت باقی رہ جاتی ہے اور تطبیق و عدم تطبیق کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے۔

وجودی وظلالی تعبیر

دراصل شیخ اکبرؒ اور حضرت مجددؒ میں اختلاف، ربط خالق وخلق کی تعبیرات میں ملتا ہے اور انہی دو تعبیرات یا نظریات کے اختلاف کو دور کر کے تطبیق دینے کی کوشش حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور مولانا اسمٰعیل شہید دہلویؒ جیسے بزرگوں نے فرمائی ہے۔ اس کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ تعبیر وجودی اور تعبیر ظلالی کو اختصار کے ساتھ پیش کر دیا جائے۔

تعبیر وجودی

خوب سمجھ لو کہ تخلیق، اشیا کا عدم محض (۷) سے پیدا ہونا نہیں ہے کیونکہ عدم سے عدم ہی پیدا ہوتا ہے، نہ ہی عدم محض ۸ کا اشیا کی صورت میں نمایاں ہوتا ہے۔ کیوں کہ عدم محض تعریف ہی کی رو سے کوئی شے نہیں کہ کسی ہستی کا مادہ بن سکے یا اسکو کسی ہستی کی صورت میں ڈھالا جاسکے (العدم لایوجد) اور نہ ہی (۳) حق تعالیٰ کا خود صورتوں میں تقسیم ہوجانا ہے کیونکہ وہ تجزی اور تبعیض سے منزہ ہے۔ تعالی اللہ عن ذلك علواً اکبیرا، تخلیق حق تعالیٰ کا مع بقائیہ علی ماھو علیہ کان بصور معلومات، بمصداق ھوالظاہر تجلی فرمانا ہے اور یہ تجلی (یا تمثل) ان صور علمیہ (ذاتِ اشیاء یا حقائق کونیہ) کے مطابق ہورہی ہے، جو ذاتِ حق میں مخفی اور علم میں مندرج ہیں۔ اسی تجلی تمثل کا نتیجہ ہے کہ اشیاء کا نمود باحکام و آثار خود بالتفصیل ان کی قابلیتِ ذاتی کے مطابق خارج میں، جو وجود ظاہر ہے، ہورہا ہے ہر صورت علمی جو ذاتِ شے یا ذات خلق ہے، اپنے اقتضائے ذاتی اور استعداد اصلی کے مطابق فیض یابِ وجود اور بہرہ یاب صفاتِ وجودی ہورہی ہے۔

خوب سمجھ لو کہ خلق کا وجود حق تعالیٰ کے ظہور یا تجلی و تمثل کے بغیر ناممکن ہے اور حق تعالیٰ کا ظہور یا تجلی و تمثیل بغیر صور خلق (صور علمیہ) کے ممکن نہیں، یہ شیخ اکبر کے الفاظ میں ایک دوسرے کے آئینے ہیں۔ (۸)

تعبیر ظلالی

صفات ثمانیہ (حیات، علم، ارادہ، قدرت، سماعت، بصارت، کلام) خارج میں موجود نہیں اس لیے ان کو ذات سے خارج میں متمیز ہونا چاہیے ان صفات کی اثر آفرینیوں کی کیفیت یہ ہے کہ ہر ہر صفت کے مقابل ایک عدم ہے مثلاً علم کا مقابل جہل ہے اور قدرت کا مقابل عجز۔ اور یہ تمام ''اعدام'' علم حق میں متمیز اور واضح ہیں اور تمیز وضاحت کی اس نوعیت سے ان کو اسماء و صفات کے لیے بمنزلہ آئینوں کے کردیا ہے یا یوں کہیے کہ انوارِ حق کے نقطۂ نظر سے ان کی حیثیت مہبطِ انوار یا تجلی گاہ کی ہے۔ ان معنوں میں حقائق ممکنات کا مطلب یہ ہوا کہ یہ اسماء و صفات کے ان عکوس و ظلال سے تعبیر ہیں جو ان اعدام پر اثر انداز ہوتے ہیں گویا اعدام کو مادہ ٹھہرانا چاہیے اور یہ عکوس و ظلال جو ان پر اثر انداز ہوتے ہیں صورت ہے جو مادہ میں حلول پذیر ہے۔

گویا تعبیر وجودی کی رو سے وجود واحد ہے اور وہ وجود حق ہے البتہ ذات دو ہیں، ایک ذات حق اور دوسری ذات خلق۔ ذواتِ خلق کی حقیقت یا مادہ وہ صورِ علمیہ یا اعیانِ ثابتہ ہیں جو ذات میں مخفی اور علم حق میں مندرج ہیں ان صور یا اعیان پر صفات کی تجلی پڑتی ہے تو اشیاء کا ظہور ہوتا ہے، شیخ اکبر قدس سرہٗ کے نزدیک عدمِ محض کوئی شے نہیں کہ ہستی کا مادہ بن سکے یا خود ہستی کی صورت میں ڈھل سکے۔ اس کے بالمقابل تعبیر ظلالی کی رو سے وجود دو ہیں ایک وجود حق دوسرا وجود خلق، اور وجودِ خلق کا مادہ صفاتِ حق کے متقابل اعدام (علامات) ہیں، ان اعدام پر ان صفاتی تجلیات کی جو اعیانِ ثابتہ پر پڑتی ہیں، عکوس و ظلال اثر انداز ہوتے ہیں تو وجود خلق کا ظہور ہوتا ہے اس طرح حضرت مجدد قدس سرہ کے نزدیک خلق کا مادہ وہ عدمات ہیں جو صفاتی تجلیات کے عکس اور پرتَو کو قبول کریں۔

مذکورہ دونوں تعبیرات کی مفصل بحث سے جس کو دلچسپی ہو اسے ''جواہر الحقائق'' (۹) مصنفہ حضرت سید شاہ عبداللطیف المعروف بہ سید شاہ محی الدین قادری دہلوی رحمۃ اللہ کا مطالعہ کرنا چاہیے مجھے تو صرف یہ عرض کرنا ہے کہ مذکورہ تعبیرات میں جو واضح طور پر الگ الگ ہیں گیارہویں صدی ہجری کے بعد کے بعض بزرگوں نے تطبیق ظاہر فرمائی۔ ان میں حضرت شاہ ولی اللہ، حضرت مولانا اسمٰعیل شہید اور حضرت شاہ حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمہم اللہ بطور خاص قابل ذکر ہیں۔

تطبیقات

حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی نے نظریہ وحدۃ الوجود اور نظریہ عکوس ظلال میں اس طرح تطبیق ظاہر فرمائی ہے کہ:

فحقائق الممکنات عند الشیخ ابن العربی تلک الاسماء والصفات متمیزۃ فی العلم وعند الشیخ

المجدد انما هی عدمات العكست فیها انوار الاسماء والصفات و تلك العدمات و ذلك الا نعكاس انما كانت فی العلم ولكن الفاعل المختار جل مجده اذا شاء ان یوجد ماهیة من الماهیات مارج جعلها متصفة بالوجود الظلی فیصیر موجود فی الخارج۔(۱۰)

''حقائق ممکنات کے بارے میں شیخ ابن عربی کے نزدیک یہ اسماء و صفات ہی کا دوسرا نام ہے کہ جبکہ یہ مرتبہ علم میں یقین ووضوح کی کیفیتوں کے حامل ہوں اور شیخ المجدد کی رو سے یہ عدمات ہیں جن پر اسماء و صفات منعکس ہوتے ہیں البتہ (یہ صحیح ہے کہ) ان عدمات اور عکوس کا محل اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے لیکن جب اللہ تعالیٰ جو فاعل و مختار ہے یہ چاہتا ہے کہ ماہیت معلومہ میں سے کوئی ماہیت حیز علم سے نکل کر وجود میں آئے تو وہ اسے وجود ظلی بخش دیتا ہے اور (وہ ہیت) خارج میں موجود ہوجاتی ہے۔

اس طرح شاہ صاحبؒ کے نزدیک دونوں تعبیرات میں معمولی سا فرق ہے اور آگے یہ توجیہہ فرماتے ہوئے کہ حقائق ممکنہ کا اطلاق کئی معنی پر ہوتا ہے خلاصہ بحث کے طور پر تحریر فرماتے ہیں۔

وبالجملہ فالعقول بان حقائق الممكنات عكوس الاسماء المنطبعة فی الاعدام المقابلة لها لیس مخالفاً لكلام الشیخ ابن العربی والتباعة (۱۱)

''خلاصہ کلام یہ ہے کہ یہ کہنا کہ حقائق ممکنات دراصل عکوس و ظلال ہیں جو اعدامِ متقابلہ میں مرتسم ہوتے ہیں۔ کسی طرح بھی شیخ ابن العربیؒ اور ان کے متبعین کی تصریحات کے خلاف نہیں۔''

اسی طرح مولانا اسمٰعیل شہید نور اللہ مرقدہٗ اپنی تصنیف عبقات میں اس عنوان کے تحت کہ کیا اختلاف وجود وشہود نزاع لفظی ہے؟ تائیداً یوں تحریر فرماتے ہیں:

''بہرحال عارف جامیؒ اور شیخ صدر الدین قونویؒ کے متعلق سمجھا جاتا ہے کہ یہ لوگ شیخ محی الدین ابن عربیؒ کے نظریہ وحدۃ الوجود کے سب سے بڑے حامیوں میں ہیں لیکن وحدۃ الوجود کا جو واقعی مطلب ان حضرات نے خود بیان کیا ہے اس میں اور حضرت مجدد الف ثانیؒ جو کچھ فرماتے ہیں اس میں انصاف سے بتاؤ کیا اختلاف ہے اور دونوں مسلکوں میں کیا فرق ہے؟

بہر کیف فاطر ومفطور (خالق ومخلوق) میں قیومیت کے علاقہ کو مان لینے کے بعد دونوں دعوے درست ہوجاتے ہیں یعنی یہ بھی کہ (وجوداً) فاطر ومفطور میں اتحاد بھی ہے اور یہ بھی کہ موطن یا محل ومقام نیز ماہیت کے لحاظ سے دونوں میں جو مغائرت پائی جاتی اس اس کی وجہ سے ایک دوسرے کا غیر بھی ہے۔ واقعہ یہی ہے جس کے دو پہلو ہیں اور ہر ایک فریق ان دو پہلوؤں سے کسی ایک پہلو کی طرف زیادہ جھک گیا ہے۔(۱۱)

رہے ہمارے تیسرے بزرگ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی قدس سرہٗ انہوں نے جس تطبیق کی سعی فرمائی ہے، وہ تعبیرِ ظلالی کے ساتھ نہیں ہے بلکہ شہودِ کشفی کے ساتھ ہے جو سالک طریق کو مشاہد ہوتی ہے اور اس پہلو سے وجود وشہود کو نزاعِ لفظی ارشاد فرمایا ہے۔ چنانچہ حکیم الامۃ مولانا اشرف علی تھانویؒ نے اپنی مشہور تصنیف ''التکشف من مہمات التصوف'' میں جہاں ''تحقیق مسئلہ وحدۃ الوجود و وحدۃ الشہود کا عنوان قائم فرمایا ہے۔ اس کے ذیل میں عارف رومیؒ کا یہ شعر بطور عنوان ثانی تحریر فرمایا ہے:

جملہ معشوق است و عاشق پردۂ
زندہ معشوق است و عاشق مردۂ

اور پھر اپنے شیخ حضرت اقدس حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کی ترجمانی فرماتے ہوئے کشفی وجود اور کشفی شہود میں تطبیق کی صورت ظاہر فرمائی ہے اور اس جملہ پر یہ تشریح ختم فرمائی ہے کہ

""پس وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود میں اختلاف لفظی ہے کما قال مرشدیؒ""

لیکن اس کی بابت پہلے عرض کیا جاچکا ہے کہ جب خود امامِ ربانی مجدد الف ثانیؒ کشفی وجود کے مخالف نہیں بلکہ موئید ہیں تو پھر تطبیق یا عدم تطبیق کی سرے سے ضرورت ہی کیا باقی رہ جاتی ہے اس کے بعد بات صرف تعبیر وجودی وظلالی کی غور طلب رہتی ہے کہ ان میں تطبیق اطمینان بخش ہے یا نہیں؟

تطبیق سے اضطراب نہیں مٹتا

حقیقت یہ ہے کہ گو حضرات شاہ ولی اللہؒ و مولانا اسمٰعیل شہیدؒ نے تطبیق کی راہ اختیار فرمائی ہے مگر خود یہ حضرات جب حضرت شیخ مجددؒ کی تعبیر سے پوری طرح مطمئن نظر نہیں آتے تو ان کی تطبیقات کمزور پڑ جاتی ہیں۔ مثلاً حضرت شاہ صاحب اسی مکتوب مدنی میں اپنی اس تحریر کے متصلاً بعد جو تطبیقات کے زیر عنوان اوپر نقل ہوچکی ارقام فرماتے ہیں:۔

واختلف اقوالہ فی العالم فقال مرۃ ہو موجود فی الخارج وجوداً ظلیاً وقال اخریٰ ہو موجود فی الوہم الا ان اللہ تعالیٰ اتقنہ فی تلک المراتبۃ فصارا موہوما متقناً

""اس عالم (رنگ بو) سے متعلق ان کی رائے مختلف ہے کبھی تو وہ فرماتے ہیں کہ یہ عالم ظلی وجود سے بہرہ مند ہے اور کبھی یہ فرماتے ہیں یہ کائنات آراستۂ وہم ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے استواری بخشی

ہے۔ اس لحاظ سے یہ عالم اگرچہ موہوم ہے مگر استوار و محکم بھی
ہے۔"

اسی طرح شاہ اسمعیل شہیدؒ وجودی و ظلالی تعبیرات میں تطبیق دکھانے کے بعد تحریر فرماتے ہیں:

"باقی امام ربانی مجدد الف ثانیؒ کے بعض اقوال سے بظاہر یہ جو معلوم ہوتا ہے کہ ممکنات و مخلوقات کی حقیقتوں کا تعین عدم اور نیستی سے وابستہ ہے یعنی ممکنات کی اصل ماہیت و حقیقت ان کے نزدیک "عدم" ہے تو ظاہر ہے کہ اگر اس کو صحیح تسلیم کرلیا جائے تو فاطر و مفطور کے اتحاد کی جو بنیاد ہے وہی منہدم ہوکر رہ جاتی ہے کیونکہ ایسی صورت میں مفطورات و مخلوقات کا وجود سے کوئی تعلق ہی نہیں رہتا اور اتحاد کو دعویٰ جو دونوں کے درمیان کیا جاتا ہے وہ تو اسی پر مبنی ہے کہ مخلوقات کے لیے بھی وجود مانا جائے۔ لیکن مجدد صاحب کی اس سے کیا مراد ہے؟ ہم جیسے لوگ جو کشف و شہود کی دولت سے محروم ہیں ان کی سمجھ سے یہ خارج ہے کوئی ایسی راہ ہمارے سامنے نہیں ہے جس کے ذریعہ سے ان کے اس دعوے کے صحیح مطلب کو ہم دریافت کرسکتے ہوں۔ واقعہ یہ ہے کہ عدم اور نیستی تو خیر دور کی بات ہے۔ کسی معدوم شے کے متعلق بھی ہم یہ سوچ نہیں سکتے کہ کسی موجود شے کی قبولیت کا کام انجام دے یعنی کسی موجود چیز کی قیومیت شے معدوم ہو!" (۱۲)

خط کشیدہ جملہ سے مولانا شہید کا ظلالی تعبیر سے عدم اطمینان واضح ہے اور راقم الحروف کی عرض صرف یہی ہے کہ تطبیقی راہ سے اضطراب نہیں مٹتا۔

تطبیق کی بنیاد صرف مصلحت ہے

تصریحات بالا کو دیکھ کر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان اکابر نے یہ راہِ تطبیق جو تکلف سے خالی نہیں کیوں اختیار فرمائی؟ اس کا جواب باصواب وہ ہے جو حضرت اقدس میرزا مظہر جان جاناں قدس سرہٗ کے قلم مبارک سے تحریر ہوا ہے، حضرت ممدوح کے خلیفہ مولانا غلام یحییٰ بہاریؒ نے ایک رسالہ اس موضوع پر تحریر فرمایا کہ وجودی و شہودی نظریات الگ الگ ہیں۔ ان میں تطبیق تکلف ہے، خلیفہ رشید کے اس رسالہ پر تقریظ حضرت شیخؒ نے تحریر فرمائی ہے جس میں صراحت فرمائی ہے کہ جن حضرات نے ان نظریات میں تطبیق دی ہے وہ محض بر بنائے مصلحت ہے، فرماتے ہیں:۔

> ''تطبیق کے مسئلہ میں پڑنے کی ضرورت نہ تھی؛ دونوں مکاشفات میں یہ تطبیق تکلف سے خالی نہیں لیکن ایک مصلحت خیر کی بنا پر یہ توفیق و تطبیق اختیار کی گئی تاکہ دو بڑی جماعتوں میں مصالحت کی صورت پیدا ہوجائے۔ اللہ اس بندہ پر رحم فرمائے جو انصاف کرے اور مباحثہ سے اپنے آپ کو بچائے۔''

یعنی تطبیق محض اس مصلحت سے اختیار کی گئی کہ شیخ اکبرؒ اور شیخ مجددؒ کے متبعین آپس کے اختلاف سے بچیں اور دونوں اکابر شیوخ کی تعظیم و ادب ملحوظ رہے، ورنہ حقیقتاً دونوں نظریات میں تطبیق ایک تکلف ہے کیونکہ وہ الگ الگ حیثیت کے حامل ہیں۔

شیخ اکبرؒ اور شیخ مجددؒ کے علوم کا فرق و امتیاز

اس ناچیز کی رائے میں اکابر عارفین دو گروہ میں تقسیم ہیں اور ان کے فرق و امتیاز کو نہ سمجھنے سے غیر ضروری بحثیں چھڑ جاتی ہیں۔۔۔ ایک گروہ تو مطلق شہبازانِ معرفتِ الٰہیہ کا ہے جو اسرار کے اظہار پر مامور ہوتے ہیں۔(۱۳)۔ انہیں اس سے سروکار نہیں ہوتا کہ ان کی باتیں نا اہلوں اور سخن ناشناسوں تک پہنچ کر فتنہ کا سبب بنیں گی یا

تصدیق وتکذیب کا بازار گرم ہوگا۔ اس کے بالمقابل دوسرا گروہ مجددین دین کا ہے جو تطہیر عقائد، اصلاح اعمال، دفع بدعات اور احیائے سنت پر مامور ہوتے ہیں۔ یہ حضرات اپنے منصب کی پابجائی میں نہ صرف ضلالت وگمراہی کی بلکہ ان کے اسباب کی بیخ کنی کی کوشش فرماتے ہیں۔ جو وجۂ ضلالت نظر آتے ہیں اور ضرورت پڑنے پر ایسی عارفانہ اصطلاحات جن کی اہل ضلالت نے آڑ لی ہو نہ صرف انکی تردید کرتے ہیں بلکہ فتنہ کی شدت پر نظر کر کے خود صاحب اصطلاح عارف پر تک صاف نکیر فرما دیتے ہیں حالانکہ اس مجبورانہ عمل میں ان کا دل دھڑکتا ہے اور کبھی اس دھڑکن کی آواز دوسروں تک بھی پہنچ جاتی ہے۔ اس لیے مطلق عارفین کے علوم کا تقابل حضرات مجددین کے علوم سے نہ کیا جاسکتا ہے نہ کیا جانا چاہیے۔ راس الصوفیہ شیخ اکبر قدس سرہٗ اور حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہٗ کی مثال اس کی آئینہ دار ہے کہ کہاں تو حضرت مجددؒ پوری قوت سے تردید فرماتے ہیں کہ ہم کو فص (فصوص الحکم) نہیں نص (قرآن) چاہیے ہم کو فتوحاتِ مدنیہ (احادیث نبویہ) نے فتوحات مکیہ (تصنیف شیخ اکبر) سے مستغنی کردیا ہے وغیرہ اور کہاں شیخ کی عظمت کی تاکید فرماتے ہیں۔ ان کو مقبول بارگاہ الٰہی تسلیم فرماتے ہیں۔ ان کے ''منکر'' کو ''خطرے'' میں بتلا بتلاتے ہیں بلکہ شیخ ممدوح کا یہ ''احسان'' مانتے ہیں کہ انہوں نے:

> ''کمالِ معرفت سے اس دقیق مسئلہ (وحدۃ الوجود) کی تشریح فرمائی اور ابواب وفصول میں ترتیب دے کر صرف ونحو کی طرح مدون فرمایا (۱۴)''

اے کاش کہ حضرت شیخ مجددؒ کے مکتوبات شریف پر تاریخیں مندرج ہوتیں تاکہ حضرت کے اقوال میں ناسخ ومنسوخ قول کا تعین ہوسکتا۔

بہر حال حضرت مجدد الف ثانیؒ تو خیر حضرت شیخ اکبرؒ کے معاملہ میں اتنے شدید نہیں جتنا کہ شیخ الاسلام علامہ احمد تقی الدین ابن تیمیہؒ (ف 728ھ) جو حضرت ابن عربیؒ کی بعد والی صدی کے مجددین میں شمار کیے جاتے ہیں۔ (۱۵)۔ علامہ ممدوح کی شیخ اکبرؒ پر دلخراش تنقید سے کون ذی علم واقف نہیں، مگر ایسے سخت ناقد کے قلب کی گہرائی میں بھی شیخ

کی تصدیق ثبت نظر آتی ہے۔ اور وہ اعتراف پر مجبور ہو ہی جاتے ہیں۔ علامہ ممدوح رحمۃ اللہ علیہ نے نصر بن سلیمان المنبجی (ف 719ھ) کے نام جو مکتوب، اپنی رحلت سے تقریباً نو برس قبل تحریر فرمایا ہے اس کا اقتباس ملاحظہ ہو:

''حادث و محدث کا وجود عین خالق کا وجود ہے نہ تو وہ خالق کا غیر ہیں نہ ہی اس کے سوا کچھ اور ہیں اس اصل کو سب سے پہلے ابن عربیؒ ہی نے پیش کیا۔ وہ اس معاملہ میں بالکل منفرد ہیں۔ ان سے پہلے کسی شخص یا عالم نے یہ نظریہ پیش نہیں کیا۔ آجکل کے تمام اتحادی اس نظریہ کی پیروی کر رہے ہیں لیکن ان سب میں ابن عربی اسلام سے قریب تر ہیں اور اکثر جگہوں پر ان کا کلام بہتر ہوتا ہے کیونکہ وہ ظاہر اور مظاہر کے درمیان فرق کرتے ہیں اور اوامر و نواہی اور امور شریعت کو اپنی جگہ پر برقرار رکھتے ہیں اور مشائخ نے جن اخلاق و عبادات کی تعلیم دی ہے ان پر عمل کرنے کا حکم دیتے ہیں۔(۱۵)

مندرجہ بالا نظائر سے حضرت شیخ اکبرؒ کے علوم پر حضرات مجددین کی نکیر و تنقید کی حقیقت امت کے عوام کی اصلاحی مصلحت کے سوا اور کیا ٹھہرتی ہے اور ان تنقیدات سے معارف کی حقانیت پر کیا آنچ آتی ہے، اسی لیے مجھ عاجز کے نزدیک ائمہ عارفین کے علوم سے حضرات مجددین کے علوم کا تقابل نہ صحیح ہے نہ ضروری، تقابلی مطالعہ چونکہ عہد رواں کا ایک فیشن بن گیا ہے۔ اس لیے اگر کرنا ہی ہو تو ایک امام عارف کے علوم کا دوسرے امام عارف کے علوم سے ایک مجدد کے علوم کا دوسرے مجدد کے علوم سے تقابل ہونا چاہیے تا کہ غیر واقعی بحثوں کا خاتمہ ہو، اور یہ ذوق عام ہوجائے کہ ہر شخص اپنی مناسبت اور حد استعداد کے مطابق کسی بھی بزرگ سے استفادہ کرے اور اور دوسرے پر طنز و تعریض سے اپنی زبان اور قلم کو بچائے رکھے۔

آرزو می خواہ لیک اندازہ خواہ

حاصل گفتگو

یہ ہے کہ وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود الگ الگ نظریات ہیں۔ ان میں تطبیق کی کوشش گو ''مصلحت خیز'' ہی کی بنا پر ہو تکلف سے خالی نہیں۔ دوسرے یہ کہ ان نظریات کے فرق و امتیاز کا قائل ہوتے ہوئے دونوں بانیانِ نظریات کا ادب لازم رکھا جانا چاہیے جو کچھ مشکل نہیں، کیونکہ جب امام بخاریؒ کی امام ابوحنیفہؒ پر سخت تنقید کے باوجود ہم دونوں ائمہ دین کی عظمت و ادب کو بخوبی ملحوظ رکھے ہوئے ہیں تو ان خاصانِ معرفتِ الٰہیہ کا باہمی اختلاف ان کے یکساں ادب سے کیوں مانع ہو؟ داع نفسك و تعال (۱۷)

حواشی

۱۔ دمغ الباطل مصنفہ شاہ رفیع الدین دہلویؒ

۲۔ شیخ اکبر قدس سرہٗ فرماتے ہیں:

فانی رایت رسول اللہ ﷺ فی مبشرۃ فی العشر الاخر من محرم سنۃ سبع وعشرین وسمانیۃ بمحروسۃ دمشق دبیدہ کتاب فقال لی ھذا کتاب فصوص الحکم خذہ واخرج بہ الی الناس ینفعون بہ

میں نے ایک رویائے بشارت میں جو مجھ کو دکھلایا گیا رسول اللہ ﷺ کو دیکھا محرم 726ھ کے اخیر عشرے میں، محروسہ دمشق میں اور آپ کے دستِ مبارک میں ایک کتاب تھی، آپ نے فرمایا کہ یہ کتاب فصوص الحکم ہے، اسکو لے اور لوگوں میں بیان کرتا کہ وہ اس سے مستفید ہوں۔

شیخ اکبرؒ کے ان الفاظ کی تشریح کے لیے ملاحظہ ہو ''افادات شیخ محی الدین ابن عربیؒ مصنفہ حضرت شیخ محب اللہ الہ آبادیؒ

۳۔ حضرت خواجہ عبیداللہ احرار قدس سرہٗ سلسلہ نقشبندیہ کے عظیم ترین شیوخ میں شامل ہیں۔ ان کے ''نصائح میں وحدۃ الوجود کی پرزور تائید ملتی ہے۔ ارشاد ہے۔

''قرآن حدیث، فقہ، ان تینوں کا خلاصہ اور نچوڑ تصوف ہے اور تصوف کا نچوڑ وحدۃ الوجود کا مسئلہ ہے۔ اور وحدۃ الوجود باتیں بنانے سے حاصل نہیں ہوتا بلکہ بلکہ دل کے آئینہ کو نقوشِ کونیہ سے صاف کریں اور وتبتل الیہ تبتیلاً کا مصداق بن کر سب سے ٹوٹ پھوٹ کر خدائے تعالیٰ کی طرف ہی جھک پڑیں اور اسی کے ہو رہیں جب کہیں جا کر دل سدھرتا، سنبھلتا اور ایسا چمکتا ہے کہ خود بخود وحدۃ الوجود کا مسئلہ اس میں عیاں ہو جاتا ہے۔

(دیکھئے گلزار اولیاء مولفہ شیخ کبیر و محدث جلیل ابو الحسنات سید عبداللہ شاہ حیدر آبادی نقشبندی مجددی قادریؒ)

۴۔ حضرت مجدد الف ثانی مولفہ شاہ زوار حسینؒ بحوالہ روضۃ القیومیہ (ص ۱۵۸)

۵۔ حضرت شیخ وجیہ الدین گجراتیؒ بڑی قوت سے فرماتے ہیں ''کسے کہ منکر توحید و وحدۃ وجود باشد اور تصور نقش اللہ و شغل طاقچہ باید فرمود، چوں عمل کند آہیں جھک مار کر قبول کرے گا'' (علمی نقوش صفحہ 101 مولفہ شیخ طریقت ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان صاحب)

۶۔ اس ''شرط عبور'' کی حقیقت عارف باللہ حضرت پیر سید مہر علی شاہ نور اللہ مرقدہ نے یوں بیان فرمائی ہے:

''حضرت مجدد صاحب کو شغل اوقات نے حضرت شیخ (ابن العربی) کی کتابوں کی بالا ستیعاب مطالعہ کی فرصت نہیں دی، حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے بھی مکتوب مدنی میں ایسا ہی فرمایا ہے۔ ورنہ (حضرت مجددؒ) ایسا نہ فرماتے، ہمارے اور شاہ ولی اللہ کے قول کی دلیل یہ ہے کہ توحید وجودی دو قسم کی ہے، اول وہ جو اثنائے سلوک میں بہ سبب ذہول ماسوی اللہ کے پیش آتی ہے اور اس میں استغراق، عدم فرق مراتب اور اختلاف احکام بحسب درجہ امکان کا موجب ہوتا ہے۔ اس مقام توحید کو حضرت شیخ فتوحات مکیہ میں سالک کے نقصان سے نشان دیتے ہیں۔ دوم توحید کاملین ہے کہ انتہائے منازل میں ذہول کے باعث نہیں بلکہ مشاہدات یقینیہ سے حاصل ہوتی ہے۔ شیخ توحید کی اس دوسری قسم والوں میں سے ہیں اور لیس فی الوجود الا ھو

کے قائل اور ورودِ احکام شرعیہ کا اعتراض اس طرح دفع کرتے ہیں کہ حقیقتِ واحدہ جس میں اثنیت اور دوئی قطعاً ملحوظ نہیں وہ تو کمال ذاتی کے اعتبار سے ہر اس چیز سے منزہ ہے جو دل میں آئے وہاں اجرائے احکام کی گنجائش کہاں وہاں تو احکام مرتبہ تنزلات وتعینات پر وارد ہوتے ہیں۔ اور تلوثِ عیوب کی نسبت جاعل اور مظہر تک نہیں پہنچتی بلکہ یہ امر بعض طبائع دون بعض تک متصور ہے اور اجسام کثیفہ کے خواص سے ہے۔ ماتریٰ فی خلق الرحمن من تفاوت — حقیقت میں نظر میں عین واحد اور احکام مختلف ہیں کیونکہ مظاہر کی ہستی دونوں عدموں کے درمیان مستعار ہے نہ خود بخود ظہور کیا نہ اپنے آپ قائم ہے بلکہ ظہور و قیام میں مظہر و قیوم کی طرح محتاج ہے۔ گویا مظاہر کا ظہور اسمِ ظاہر کے ظہور سے ہے ورنہ ممکناتِ زائلہ حادثہ کی کیا قدرت کی بجز فیضِ ربوبیت ھوالظاہر کوئی مستقل نام ونشان رکھیں۔ پس بہ ایں معنی غیریت منتفی ہے۔ لیکن ان مقبولین کے نزدیک حفظِ مراتبِ توحید ضروری ہے۔

گر حفظ مراتب نہ کنی زندیقی

۷۔ قرآن اور تصوف مولفہ ڈاکٹر میر ولی الدینؒ مطبوعہ ندوۃ المصنفین دہلی ص 79

۸۔ مکتوب مدنی از شاہ ولی اللہ دہلوی مترجمہ مولانا محمد حنیف ندوی مطبوعہ ادارہ ثقافتیہ اسلامیہ لاہور ص 63

۹۔ مطبوعہ المطبع مظہر العجائب مدرس 1274ھ

۱۰۔ جلد اول تفہیمات الٰہیہ۔ آخری مکتوب الملقب بہ ''مکتوب مدنی''

۱۱۔ عبقات، ترجمۃ اردو از حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ مطبوعہ حیدر آباد دکن (ص 91)

۱۲۔ ترجمہ عبقات محولہ سابق ص ص 92-91

۱۳۔ اور اذنِ مبارک سے سر آگے نہیں بڑھتے۔ جیسا کہ شیخ اکبر قدس سرہٗ فصوص الحکم کی ''فصِ آدمیہ'' میں فرماتے ہیں۔

''میں نے ان اسرار میں سے اس کتاب میں صرف اسقدر اسرار بیان کیے ہیں جن کی

تعین کی گئی ان سب اسرار کو اس کتاب میں پیش نہیں کیا جو مجھ پر کھولے گئے کیونکہ وہ کسی ایک کتاب میں کہاں سما سکیں۔۔۔ میں نے جو کچھ مشاہدہ کیا اور دیکھا وہی اس کتاب میں لکھوں گا اور وہ بھی اسی قدر جتنا کہ رسول اللہ ﷺ نے متعین و مقرر فرمایا۔"

۱۴۔ مکتوبات امام ربانی جلد 3، مکتوب 89

۱۵۔ حافظ سیوطیؒ نے ابن تیمیہؒ کے معاصر ابن دقیق العیدؒ کو ساتویں صدی کا مجدد مانا ہے۔

۱۶۔ امام ابن تیمیہؒ "مصنفہ مولانا محمد یوسف کوکن عمری ص ص 324 تا 325

۱۷۔ نفسانیت کو چھوڑ اور چلے آ۔

حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ کا نظریۂ تصوف

حضرت مولانا نور اللہ مرقدہٗ علوم ہی کے محقق نہیں تھے بلکہ فن تصوف میں بھی ان کا محققانہ مقام نمایاں ہے، اسی لیے ان کے نظریہ تصوف کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔

جب تصوف کی بات ہو تو حضرت ممدوح کے نزدیک ضروری ہے کہ سب سے پہلے یہ سمجھ لیا جائے کہ اس عنوان کے دو دھارے ہیں جو ساتھ ساتھ بہہ رہے ہیں حالانکہ درحقیقت ان کے درمیان ایک آڑ ہے جو ان دونوں کی انفرادیت کو قائم رکھے ہوئے ہے، اس فرق کی دریافت ضروری ہے تاکہ انکے باہم ہونے سے ایک ہونے کا دھوکا نہ کھا جائیں۔۔۔فرماتے ہیں:

> ''اصل یہ ہے کہ تصوف کا لفظ اب مدت سے دو معنوں میں بولا جاتا ہے۔ یا یہ کہو کہ تصوف کی دو قسمیں ہیں ایک مذہبی تصوف اور دوسرا فلسفیانہ تصوف، مذہبی تصوف سے مقصود مذہبی روح یعنی اخلاص، محبت، زہد، تقویٰ، عبادت اور شریعت پر سنت نبوی کے مطابق عمل ہے اور اسی کا نام حدیث کی اصطلاح میں احسان ہے۔ پہلی اور دوسری صدی میں زہاد اور عباد اسی قسم کے تھے، عام مسلمانوں سے الگ ان کے کچھ عقائد اور خیالات نہ تھے، وہ فلسفہ سے بھی نا آشنا تھے، وہ صرف قرآن و حدیث سے توغل رکھتے تھے اور روزہ نماز، تلاوت، قرآن اور نوافل ان کا شب و روز کا مشغلہ تھا اور اخلاصِ عمل اور خلق کی خدمت پر ان

کے ہاں سب سے زیادہ زور تھا۔

اور فلسفیانہ تصوف سے مقصود الٰہیات کے متعلق حکیمانہ خیالات رکھنا اور فلسفہ کی طرح خشک زندگی اختیار کر کے ان کی تعلیمات پر عمل کرنا تھا۔

پہلے تصوف کا مرکز خیال نبوت ہے اور اس میں انبیاء کے احوال کی پیروی ہوتی ہے اور دوسرے تصوف کا مرکز ''حکمت'' ہے اور اس میں فلاسفہ اور حکماء کے احوال کے پیروی کی جاتی ہے، وشتان بینھما۔ (۱)

''اس فلسفیانہ تصوف کا ماخذ یونان کا اشراقی اور اسکندریہ کا افلاطونی اسکول ہونا بعض قدیم مسلمان حکماء کے نزدیک بھی مسلم تھا۔ (۲)

''شیخ فرید الدین عطارؒ جو مشہور صوفی ہیں اپنے تذکرۂ اولیاء میں شیخ ابوالحسن خرقانی المتوفی 425ھ اور شیخ ابو علی سیناؒ المتوفی 428 کی باہمی ملاقات کے تذکرہ کے بعد لکھتے ہیں ــــ تابعدازاں طریقت (تصوف) بفلسفہ کشید چنانکہ معلوم ہست ــــ وغیرہم (۳)''ان حوالوں سے یہ واضح ہے کہ فلسفیانہ تصوف فلسفہ اشراق جدید افلاطونی الٰہیات اور اخوان الصفا کی تاویلات ایک ہی سرچشمہ کی دھاریں ہیں۔ (۴)

مذہبی تصوف اور فلسفیانہ تصوف کا فرق بتلاتے ہوئے وشتان بینھما جو فرمایا اور آگے چل کر فلسفیانہ تصوف کے ماخذ کی نشاندہی اور اس پر شیخ ابوالحسن خرقانی رحمۃ اللہ کی جو تصدیقات ذکر فرمائیں۔اس سے صاف ظاہر ہے کہ حضرت مولانا صرف اس تصوف کے قائل ہیں جن کا بقول ان کے ''مرکز خیال نبوت ہو'' اور ''جس میں انبیاء کے احوال کی

پیروی ہوتی ہو"

یہاں اگر یہ شبہ ہو کہ اوپر کے حوالے سب حضرت مولانا کی تصنیف خیام سے پیش کیے گئے ہیں جو ان کی جوانی کی تصنیف ہے اور اس وقت وہ عملاً اس کوچہ میں داخل نہیں ہوئے تھے ممکن ہے بعد میں اس نظریہ میں تغیر آیا ہو، مگر یہ شبہ محض وہم ہے، اس لیے کہ لڑکپن ہی میں وہ تصوف کے مکتب میں درس لے چکے تھے اور اس کی صورت یہ تھی ایک طرف وہ اپنے بڑے بھائی شاہ ابوحبیب نقشبندی مجددیؒ کے حلقہ توجہ میں بیٹھا کرتے تھے جو سخت متبع سنت تھے اور دوسری طرف اسی عمر میں انہیں سے شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کی "تقویت الایمان" بھی سبقاً سبقاً پڑھی تھی تو ظاہر ہے کہ ان کے نزدیک تصوف وہی قابل قبول تھا جس کا مرکز خیال نبوت ہو اور جس میں انبیاء کرامؑ کے احوال کی پیروی پر زور دیا جاتا ہے۔ اب رہا آخرِ عمر کے نظریہ کا سوال تو اس کی صراحت بھی حاصل ہے، راقم الحروف نے بالمشافہ جب کبھی تنزلات ستہ یا وحدۃ الوجود و شہود جیسے مسائل کا تذکرہ کیا تو حضرت کی طرف سے جواب یہی پایا کہ کیا یہ قیل و قال عہد صحابہ میں ملتی ہے؟ دین کے بارے میں جو سوالات صحابہ کرام رضوان اللہ نے نہیں اٹھائے آج بھی نہیں اٹھائے جانے چاہیں، گویا جو مسلک امام دارالہجرہ مالک بن انس قدس سرہٗ کا قرآنی متشابہات کے معاملہ میں تھا وہی مسلک حضرت مولانا کا فلسفیانہ تصوف کی موشگافیوں کے بارے میں بھی رہا چنانچہ اپنے اس نقطہ نظر کا اظہار حضرت نے اپنی صوفیانہ تحریروں میں بھی پوری قوت سے فرمایا ہے۔۔۔ حضرت مولانا عبدالباری ندویؒ کی تالیف "تجدید تصوف و سلوک" پر جو مقدمہ حضرت مولانا کے قلم زرنگار کا شامل ہے، اس کے پہلے ہی پیراگراف میں یہ پر زور جملے ملتے ہیں:۔

> "اور جہاں اس کا (یعنی تصوف کا) وجود تھا بھی تو وہ محض چند فلسفیانہ خیالات کا مجموعہ ہوکر رہ گیا تھا یا اوراد و وظائف کے ایک نصاب کا ـــ سلف صالح نے اس فن کے جو ابواب و

مسائل منقح کر کے لکھے تھے وہ بالکل ہی فراموش ہو گئے تھے اور خصوصیت کے ساتھ سلوک کی حقیقت و غایت بالکل ہی چھپ گئی تھی، اور جہاں کسی قدر اس کا نام و نشان تھا، وہاں علم میں وحدت الوجود یا وحدت الشہود کی نا قابل افہام و تفہیم بلکہ ناقص تعبیر پر اور اعمال میں صرف ذکر و فکر و مراقبہ کے چند اصول پر پوری پوری قناعت تھی۔''

فقرۂ بالا سے صاف ظاہر ہے کہ حضرت مولانا فلسفیانہ تصوف سے بیزار اور سلف صالحین کے طریق کے حامی تھے اور اسی کو وہ صحیح ''مذہبی تصوف'' جوانی سے آخر عمر تک قرار دیتے رہے۔۔۔ ایک مرتبہ راقم نے حضرت سے تحریراً اجازت مانگی کہ مسئلہ تنزلات ستہ کو التکشف (مصنفۂ حکیم الامت تھانویؒ) سے اور مسئلہ وحدۃ الوجود کو لوائح جامی سے اپنے ایک استاذ جامع شریعت و طریقت (مولانا محمد صابرؒ) سے سمجھ لوں تو جواب یہ عطا ہوا:

''تنزلات وغیرہ کے مسائل علم کے لیے آپ سمجھ لیں تو اچھا ہے ورنہ درحقیقت وہ فلسفہ یا علم کلام کے مسائل ہیں، سلوک کے لیے وہ ضروری نہیں۔۔۔ لوائح جامی بھی پڑھ لیں اور سمجھ لیں۔

نیز یہ کہ:

ہمارے سلسلہ میں دوائر اور لطائف اور تنزلات وغیرہ کے مسائل معمول بہا نہیں ہیں''(۶)۔

نفس تصوف سے متعلق حضرتؒ کے نظریے کو سمجھنے کے بعد دوسری چیز روحانی تربیت اور سالک طریق کو مرتبہ احسان تک پہنچانے کے راستوں کی ہے۔ یہاں بھی ہم کو دو متوازی مگر متمیز طریق ملتے ہیں جن پر چل کر سالکین منزل مقصود تک پہنچتے رہے ہیں اور دونوں طریق کے رہبروں میں اللہ تعالیٰ کے بڑے مقرب، برگزیدہ اور محبوب، شیوخ اور

اولیاء موجود ہیں۔ تربیت روحانی کے ان دونوں طریقوں کی بڑی اچھی تعبیر میرے استاذ حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ نے طریقۂ غزالیہ اور طریقۂ اشغالِ مطلقہ کے عنوان سے فرمائی ہے اور امام غزالی اور شیخ اکبر محی الدین ابن العربی قدس سرہما کو ان طریقوں کا بانی قرار دیا ہے۔ طریقہ غزالیہ میں خصوصی توجہ اور اصل زور رذائل نفس کے ازالے، اخلاقِ فاضلہ کے حصول اور اعمالِ صالحہ کے اہتمام پر دیا جاتا ہے اور مرتبۂ احسان تک رسائی کی جاتی ہے اور طریقہ اشغالِ مطلقہ میں خصوصی توجہ اور زیادہ زور تصحیح فکر اور تطہیر نگاہ باطن پر دیا جاتا ہے اور مرتبۂ احسان تک پہنچایا جاتا ہے۔(۷)۔ ہمارے حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ طریقۂ غزالیہ کے موید تھے اور اسی کو زیادہ محفوظ اور انفع قرار دیتے تھے، حضرت مولانا کے نزدیک اہتمام تقویٰ کے ساتھ کثرتِ ذکر جو حضور قلب کے ساتھ ہو یہی طریق راہ سنت سے اقرب ہے فرمایا کرتے تھے کہ قرآن پاک میں قرب، معیت اور ولایت میں سے ہر نعمت کو تقویٰ ہی کا ثمرہ قرار دیا گیا ہے اور اسکے ثبوت میں منجملہ اور آیات کے یہ دو آیتیں بطور خاص پیش فرماتے تھے:

ان اولیاؤہ الا المتقون ولکن اکثرھم لا یعلمون

(انفال34)

اسکے اولیاء تو وہی ہیں جو متقی ہیں مگر ان میں بہتوں کو اس کی خبر نہیں۔

ان اللہ مع الذین اتقوا والذین ھم محسنون

(النحل 128)

اللہ ساتھ ہے ان کے جو متقی ہیں اور جو اہل احسان ہیں۔

اور اس کے ساتھ یہ فرماتے تھے کہ آپ دیکھیں گے کہ طریقِ اشغال مطلقہ کے پیروں میں عموماً تقوے کا ایسا اہتمام نظر نہیں آتا۔ درآں حالیکہ بقول حضرت مولانا نوراللہ مرقدہ

"اصل شے احکام الٰہی کی کلی اطاعت، حلال و حرام کا خیال، معاملات کی صفائی، اخلاق کی نزاہت، اتباع نبوی کا دھیان اور

تمام امور میں رضائے الٰہی کی طلب ہے، ان امور کی طرف توجہ
فرمائیں کہ یہ اصل ہیں باقی سب فروع و تدابیر" (۸)۔

تربیتی نظریہ کے بعد حضرت مولاناؒ کے صوفیانہ نظریہ کا اہم پہلو تصوف کی متکلمانہ اور فلسفیانہ اصطلاحات سے گریز اور ان کی جگہ قرآنی و حدیثی اصطلاحات کی ترویج ہے وہ "تصوف" کی اصطلاح کے بجائے حدیثی اصطلاح احسان اور قرآنی اصطلاح طریق اتقاء استعمال فرماتے تھے چنانچہ حضرت مولانا عبدالباری ندویؒ کی تالیف تجدید تصوف وسلوک پر جو مقدمہ تحریر فرمایا ہے اس کا عنوان ہے۔ "حقیقت تصوف کا مکتشف اعظم اورفنِ حصول احسان وتقویٰ کا مجدد کامل۔"

مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم کو ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:

"بار بار اپنی خوشی اور راحت اور اپنے کسی فضل پر اللہ تعالیٰ کی
حمد (اور اسکو منجانب اللہ فضلِ محض بلا استحقاق سمجھ کر) کرنا ہی
"احسان" کا زینہ ہے، جس کا رسمی نام تصوف ہے ولا
مشاحۃ فی الاصطلاحات ہم نے اب اسکا نام "طریق
تقویٰ" رکھنا چاہا ہے" (۹)۔

ایک اور مکتوب میں ہے:

"بزرگوں سے لفظ "احسان" تو اس معنی میں سن رکھا ہے اور
ٹھیک ہے کہ اس کا ورود حدیثوں میں ہے لیکن اب تو مجھے اس
کے لیے تقویٰ اور اتقاء کی اصطلاح اچھی معلوم ہوتی
ہے" (۱۰)۔

دراصل حضرت مولانا کو قرآن پاک سے اس قدر گہرا شغف تھا کہ وہ سب سے پہلے قرآن پاک ہی سے اخذ اور استناد فرمایا کرتے تھے، ایک مرتبہ حضرت مولانا سے عرض معروض کے درمیان استقامت کے سلسلہ میں میں نے عرض کیا "الاستقامۃ فوق الکرامۃ" تو فوراً فرمایا کہ اس مقولہ کے بجائے یہ کیوں نہیں فرماتے کہ "قل اللہ ثم

استفسار۔(۱۱) ایک اور مرتبہ جب صوفیہ کا زبان زد مقولہ موتو قبل ان تموتوا میری زبان سے نکلا تو ارشاد فرمایا حدیث میں عدا نفسك من الاموات! منشاء وہی تھا کہ جب اس معنی کی حدیث موجود ہے تو اسکو چھوڑ کر کوئی مقولہ کیوں بولا گیا۔

غرض یہ ذوق ان اصطلاحات اور صوفیانہ مقولوں سے متعلق تھا جن کے متبادلات قرآن یا حدیث میں موجود ہیں۔ رہی خالص وہ اصطلاحیں جو فلسفیانہ اور متکلمانہ تصوف نے پیدا کی ہیں۔ ان کے بارے میں حضرت مولانا ان اکابر تصوف پر ادنیٰ نکیر کی اجازت کے بغیر بلکہ ان کے ادب و عظمت کی تاکید کے ساتھ ان کی اصطلاحات کے ترک پر زور دیتے تھے اور اس کی دو وجہیں تھیں۔ ایک تو یہ کہ ان اصطلاحات کے ماننے اور اختیار کرنے پر تقویٰ و احسان کا حصول منحصر نہیں۔ دوسرے یہ کہ ان کی آڑ لے کر دین میں ویدانتی نظریہ ہمہ اوست اور اجرائے منصب نبوت کے فتنے اٹھا کر برجِ توحید اور ایوان نبوت کو مسمار کرنے کی کوششیں ہو چکی ہیں۔ کون صاحب علم تاریخ کے ان حقائق کو جھٹلا سکتا ہے کہ اکبر دور کے ہندوستان میں گمراہ وحدۃ الوجودیوں نے حضرت شیخ اکبر قدس سرہٗ کی اصطلاحات ہی پر اپنی تعبیر کی بنیاد رکھی تھی اور برطانوی دور کے ہندوستان میں مرزائے قادیان نے اپنے ادعائے نبوت کا جواز حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہٗ ہی کی اصطلاحات میں ڈھونڈ نکالا تھا۔۔۔ حضرت مولاناؒ کا ارشاد ہے:

> ''بہت سی باتیں کلام و فلسفہ کی راہ سے تصوف میں داخل ہو گئیں پھر عین تصوف سمجھی جانے لگیں۔ خصوصاً فلسفیانہ اصطلاحات کو دینی اہمیت دی گئی اور پھر ان کی بنیاد پر الہیاتی مسائل کی تشریح و توضیح کی گئی اور اسی کو تصوف یا فنِ احسان قرار دیا گیا اس اصطلاحی تصوف کے شیوع سے بڑی گمراہیاں پیدا ہوئیں اور نبوت و مہدیت کے دعویدار پیدا ہو گئے (۱۲)۔

وحدہ الوجود اور تنزیلات ستہ کے بارے میں ارشاد ہے۔

''اول تو یہ مدارِ طریق نہیں، پھر ان میں سے بعض تو حال کا درجہ

رکھتے ہیں (جیسے وحدۃ الوجود و شہود) اور بعض محض افلاطونی
فلسفہ کی متبدل شکلیں ہیں جیسے مسئلہ تنزلات ستہ ان کی طرف
توجہ نہ ہونا چاہیے (۱۳)۔

راقم الحروف نے عرض کیا کہ حضرت اقدس تھانوی نوراللہ مرقدہٗ نے تو التکشف اور التنبیہہ الطربی وغیرہ تصانیف میں ان مسائل پر کلام فرمایا ہے تو فوراً ارشاد فرمایا کہ یہ دکھانے کے لیے کہ ہم ان علوم سے ناواقف نہیں مگر ازراہ سلوک و طریقت حضرتؒ کو ان مسائل سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس کا تحریری ثبوت بھی ملتا ہے۔ حضرت عبدالرحیم صاحب حیدر آبادیؒ مترشد با کمال حضرت اقدس تھانویؒ) نے ہمارے حضرت مولانا سے استعدادِ امکان ذاتی اور جعل و مجعول وغیرہ کی شرح و توضیح دریافت فرمائی تھی تو حضرت مولانا نے مختصر جواب ارقام فرما کر یہ بھی تحریر فرمایا:

''یہ مسائل اصل میں علم کلام کے ہیں۔ حضرت مولانا تھانویؒ
کی یہی تحقیق ہے مگر حضرات صوفیہ نے ان مسائل میں اپنا
خیال بھی ظاہر فرمایا ہے بہر حال حضرت رحمۃ اللہ کے اتباع میں
اس فقیر ہیچمدان کو ان مسائل سے از راہ تصوف کوئی دلچسپی
نہیں'' (۱۴)۔

مختصر یہ کہ سلیمانی نظر یہ تصوف منتِ کش اصطلاحات نہیں، وہ اصطلاحات جو کلام و فلسفہ کی راہ کے تصوف میں داخل ہوئی ہیں۔

صوفیۂ کرام میں ایک اور نوعیت کی تقسیم بھی ملتی ہے یعنی ایک گروہ وہ ہے جن میں ''حرکت''، یعنی تبلیغ و اظہار دین کی جدوجہد حتیٰ کہ قتال بالسیف بھی ملتا ہے، دوسرا گروہ وہ ہے جس میں بہ ظاہر تقعد اور گوشہ گیری نظر آتی ہے مگر ان کے انفاس کی برکت سے دین اور اہل دین کو نفع پہنچتا رہتا ہے یہ دونوں اہل کمال اور مقبولین کے طبقے ہیں، نادانی اور بے بصری سے بعضے علماء ظاہر ان میں سے کسی پر نکیر کرتے اور کسی کو سراہتے ہیں حالانکہ دریائے پرشور اور بحر خموش کی افادیت اپنی اپنی جگہ ہے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ وعلیٰ

مرتضیٰ رضی اللہ عنہ جیسے مجاہدین اور صاحب تخت و نگین کو کیا حضور اکرم ﷺ نے اپنا پیرہن مبارک دے کر یہ وصیت نہیں فرمائی تھی کہ یہ قرن کے گوشہ گزین اویس رضی اللہ عنہ کو دے کر ان سے میری امت کے لیے دعا کروانا؟۔۔ بہر کیف ہم تو دونوں ہی گروہ کے افراد کی عظمت کے قائل ہیں اور اس اعتراف کے ساتھ یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ ہمارے حضرت مولاناؒ حرکی تصوف کے پیرو اور علمبردار تھے۔ ان کا نظریہ یہ تھا کہ تزکیہ نفس اور اہتمام تقویٰ کی ضروری استعداد بہم پہنچا کر دین کے ابلاغ اور اظہار کے کام میں لگ جانا چاہیے اور بے طمعی اور بے غرضی کے ساتھ تعاونوا علی البر والتقویٰ کی قرآنی ہدایت کے مطابق جہاں کہیں نیکی اور تقویٰ کے کام میں اعانت کی ضرورت ہو معاون بن جانا چاہیے۔۔۔ یہی شان خود حیات سلیمانی میں نمایاں نظر آتی ہے کہ دینی ضرورت اور فلاح ملت کے ہر کام میں وہ جماعت ادارہ، مدرسہ، کالج، عوامی مجلس اور حکومتی بورڈ کے فرق و امتیاز کو خاطر میں لائے بغیر اپنے کمالات علمی اور توجہات باطنی کے ساتھ مشیر و معاون نظر آتے ہیں۔۔۔ اسی اصول کی تلقین عام طور پر وہ کیا بھی کرتے تھے اور اس کو ضرورت وقت کا عین تقاضہ سمجھتے تھے۔۔۔ ایک مرتبہ حضرت ممدوح کی مجلس میں ذکر آ گیا امام اعظم ابوحنیفہ قدس سرہٗ کا، ایک حاضر مجلس نے ذرا مبالغہ کے ساتھ امام صاحبؒ کے حکومت سے عدم تعاون اور انکار منصب قضا کی تحسین کرتے ہوئے کہا کہ علماء کو ایسا ہی طرز اختیار کرنا چاہیے اس پر حضرت مولانا نے فرمایا خدمت دین کی نیت سے دونوں ہی صورتیں درست ہیں دیکھئے اورنگ زیب نے علماء سے تعاون طلب کیا تو شیخؒ نے تو اس سے صاف انکار فرمایا۔ مگر جو علماء آگے بڑھے وہ بھی غیر متقی نہ تھے اور ان کے تعاون سے فتاوائے عالمگیری کا جو عظیم کارنامہ انجام پا گیا آج تک مسلمان اس سے مستفید نہیں ہو رہے ہیں؟۔۔۔ اس جواب میں حضرت مولاناؒ کا نقطہ نظر صاف ظاہر ہے، ایک اور واقعہ اس سے واضح تر۔۔۔ ایک روز ایک مولوی صاحب حضرت مولانا کی خدمت میں ایک دعوت نامہ ایسی علمی تقریب کا لے کر آئے جس میں خواتین بھی شریک کر لی گئی تھیں، رقعہ دیتے ہوئے ان

مولوی صاحب نے کہا کہ حضرت کو اس مجلس میں نہ جانا چاہیے تو حضرت مولانا نے انہیں سمجھایا کہ مولانا آج وہ وقت ہے کہ جتنے گوشے آپ چھوڑتے چلے جائیں گے بے دینوں کا اس پر قبضہ ہوتا چلا جائے گا اور پھر فرمایا کہ کیا مولانا اسمٰعیل شہید طوائف کے محلہ تک نہیں چلے گئے تھے؟ انہوں نے عرض کیا کہ ہم اسمٰعیل شہید کہاں ہیں؟ اس پر حضرت نے فرمایا اور بہت کم اس ادعائی انداز سے فرمایا کرتے تھے کہ ''آپ میں اگر ہمت نہیں تو آپ میرے ساتھ چلیے''— اس سے حضرت مولاناؒ کا تقعد وتبتل یعنی گوشہ گیری کی بجائے حرکی اور اقدامی مسلک کس قدر روشن ہے۔ اس سلسلہ میں حضرت مولاناؒ کی ایک مختصر سی تحریر جو احقر کے ایک استفسار کا جواب ہے غور سے پڑھنے کی مستحق ہے۔ ارشاد ہے:

''پہلے تو یہ سمجھیں کہ جہاد اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے سعی و کوشش بالنفس والمال کا نام ہے۔ وہ کسی بادشاہ کی سلطنت کے قیام کے لیے نہیں جیسے آج کل سمجھا جاتا ہے۔ قومی حکومت و سلطنت جس کا تصور آج کل ہے وہ بھی اعلاء کلمۃ اللہ سے دور ہے۔ پھر اکابر صوفیہ جس وقت ہوئے ہیں اس زمانہ میں کسی نہ کسی معنی میں مسلمانوں کی سلطنتیں قائم تھیں، اس لیے انہوں نے مسلمانوں کو خدا کی حکومت کے مطابق بنانے کی کوششیں کیں۔''

''ہندوستان کی گزشتہ صدی کے کارناموں کے لیے آپ ''علماء کا شاندار ماضی'' کتاب محمد میاں مراد آبادی پڑھیں یہ سب حضرات مجاہد تھے۔ خود حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ مولانا قاسم صاحبؒ، مولانا رشید احمد صاحبؒ، مجاہدین میں تھے، اور خلفائے مولانا اسمٰعیل شہیدؒ کے کارنامے بھی پڑھیں جن کو مسعود عالم ندویؒ نے لکھا ہے، صحیح راہ یہ ہے کہ دل میں جہاد کی

تمنا رہنی چاہیے اور وقت پر اسکا ظہور ہو (۱۵)۔

یعنی آج کل کی مزعومہ دینی جماعت سازیاں اور ان کے زعماء کی ہنگامہ آرائیاں دین خالص کی عملی جدوجہد نہیں بلکہ حرکت و فعالیت سے مراد وہ کیفیت ہے جو مثلاً غیر منقسم ہندوستان میں حضرات اولیاء محبوب الٰہی نظام الدین دہلویؒ، مجدد الف ثانی سرہندیؒ، سید احمد بریلویؒ، محمد اسمٰعیل شہیدؒ یا حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ وغیرہم کی زندگیوں میں نظر آتی ہے۔ رحمہم اللہ تعالیٰ اجمعین ۔۔۔ حضرت مولانا اسی معنی کے "حرکی تصوف" کے قائل تھے۔

الحاصل راقم ناچیز کے نزدیک حضرت مرشدی مولانا سید سلیمان ندویؒ کے نظریہ تصوف کی رو سے اصل فن احسان والتقاء وہ ہے:

۱۔ جس کی بنیاد و مرکز خیال نبوت ہو اور جس میں انبیاء کے احوال کی پیروی کی جائے۔

۲۔ جس میں کلام و فلسفہ کی راہ سے داخل شدہ اصطلاحات اور مباحث سے احتراز ہو اور قرآن پاک اور احادیث نبویہ کی اصطلاحات اور محاورزوں پر مدار ہے

۳۔ جس میں سالکِ طریق کو رذائل نفس کے معالجہ، اہتمامِ تقویٰ اور کثرتِ ذکر مع الحضور کی تلقین کے ساتھ مقامِ احسان تک پہنچایا جائے۔

۴۔ جس میں تزکیہ اور تقوے کے رسوخ کے بعد عارف رومی کی زبان اور منشاء میں

کارِ پاکاں روشنی و گرمی است

کی تلقین اور ہر کارِ خیر سے عملی تعاون کی تاکید ہو۔

حواشی

۱۔ خیام مصنفہ حضرت علامہ سید سلیمان ندوی ص ص 313,314

۲۔ ایضاً ص 315،

۳۔ ایضاً ص318

۴۔ ایضا 318

۵۔ تذکرۂ سلیمان ص ص 36 تا38 (طبع ثانی)

۶۔ راقم کی تالیف تذکرۂ سلیمان مکتوب نمبر 56.

۷۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو حضرت مولانا گیلانی کی کتاب ''مقالات احسانی'' مرتبہ مولانا ڈاکٹر غلام محمدؒ

۸۔ سلوک سلیمانی مولفہ پروفیسر مولانا محمد اشرف خاں ص168 (جلد اول)

۹۔ مکاتیب سلیمان مرتبہ مولانا مسعود عالم ندوی۔

۱۲۔ تذکرۂ سلیمان ص ص 373 تا374 (طبع ثانی)

۱۳۔ ایضاً

۱۴۔ تذکرۂ سلیمان (طبع ثانی) ص 353

۱۵۔ تذکرۂ سلیمان ص 595 (طبع ثانی)

انوارِ محمدی ﷺ

(سیرت نبوی کا والہانہ مطالعہ)

نورِ مبارک کی تخلیق اور نبوت سے سرفرازی

کچھ نہ تھا پر ذاتِ الٰہی تو تھی۔ یکا و تنہا، یکتا و یگانہ۔ اپنی ساری صفات کو سمیٹے اور صفتِ علم کی ساری تفصیلات کو لیے ہوئے، خود ہی مشہود خود ہی شاہد، بے نیازِ شہادت، خود اہی اپنے آپ پر گواہ (۱)۔ کون بتا سکے کہ یہ خزانہ کب تک مخفی رہا، البتہ عقل اس کے ماننے پر مجبور ہے اور مشہور حدیث (۲) میں اس کا اشارہ بھی ملتا ہے کہ پھر اس ذاتِ پاک نے چاہا کہ کوئی اس کو پہچانے تو وہ تخلیق پر آمادہ ہوگئی، پھر وہاں دیر ہی کیا تھی، حکم کن (۳) سے اس نے اولین تخلیق، سردارِ دو جہاں محمد والا شان کے نورِ مبارک کی فرمائی، اس وقت نہ فرش تھا نہ عرش نہ لوح تھی نہ قلم، عالمِ امر کی تنہا زینت ''نورِ محمد'' تھا۔ اس راز کو قرآن پاک تو افشاء نہیں کرتا مگر احسان ہے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا کہ ان کے استفسار پر نطقِ نبوی سے یہ گرہ کھل گئی، حضور پُر نور ﷺ نے فرمایا:

> ''میں آدم علیہ السلام کے پیدا ہونے سے چودہ ہزار برس پہلے اپنے پروردگار کے حضور میں ایک نور تھا'' (۴)۔

نورِ محمدی تخلیقِ الٰہی کا اولین شاہکار اور حضور اکرم ﷺ کی عمر شریف کا نقطہ آغاز ہے کیوں کہ یہی نور ''روحِ محمدی'' بھی ہے اور یہ اس لیے ہے کہ اسی عالم امر میں آپ نبی بلکہ خاتم النبیین بھی بنا دیئے گئے تھے، جیسا کہ احادیث سے ثابت ہے ذیل میں صرف دو

حدیثیں نقل ہیں:

(۱) حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ صحابہ نے پوچھا یا رسول اللہ آپ کے لیے نبوت کس وقت ثابت ہوچکی تھی، آپ نے فرمایا کہ ''جس وقت آدم علیہ السلام ابھی روح اور جسد کے درمیان تھے۔''(۵)

(۲) حضرت عرباض بن ساریہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''بے شک میں حق تعالیٰ کے نزدیک خاتم النبیّن ہوچکا تھا اور آدم علیہ السلام ابھی اپنے خمیر ہی میں پڑے تھے۔''(٦)

یعنی حضور اکرم ﷺ کی منصبِ نبوت پر سرفرازی آپ کی تخلیق کے ساتھ ہی عالم امر میں ہوچکی تھی اور نبی بھی نبی خاتم بنادیئے گئے تھے، عالم ناسوت میں آپ کی تشریف آوری کے چالیس سال پر اس منصب کا اجراعمل میں آیا نہ کہ حقیقتاً اس وقت نبی بنادیئے گئے۔ اس طرح حضور ﷺ کو تخلیق میں بھی اولیت اور فردیت حاصل ہے اور خاتم النبین ہونے میں بھی یکتائی اور فردیت کا شرف حاصل ہے اس صورت میں یہ امکان ہی کہاں باقی رہا کہ آپ کے نظیر کا تصور پیدا ہوسکے۔

امرِ کن کے اولین ظہور یعنی نور محمد سے جو پو پھٹی اور اس نورِ مقدس کی ضیا پاشی جہاں جہاں تک پھیلی، جس کی وسعتیں احاطۂ تصور میں نہیں آسکتیں وہی عالم امر کے دائرے کو متعین کرتی ہے، لوح و قلم، عرش و ملائک جنت و دوزخ سب کچھ اس کے اندر ہیں

وصلی اللہ علیٰ نورِ کز وشد نور ہا پیدا

یہی نورِ محمدی بہ اعتبار روح ہر عطائے ربانی، ہر عنایت رحمانی اور ہر فضل و کرم باری کا مسبط اور منزل ہے اور پھر اسی واسطۂ مقدس سے یہ انعامات الٰہیہ مخلوق میں تقسیم ہوتے ہیں اس معنی میں حضور اکرم ﷺ کی ذاتِ اقدس کو ''برزخ کبریٰ'' کہتے ہیں، جو تخلیقی اولیت میں فرد ہے اور بعد کی مخلوقات میں نوع انبیا، جو سب سے افضل نوع ہے وہ بھی روحِ محمدی ہی سے فیضیاب ہے، بقول عارف بصیری نور اللہ مرقدہٗ

وكلهم من رسول الله ملتمس
غرفا من البحر او رشفا من لديم ؂

شیخ اکبر حضرت محی الدین ابن عربی قدس سرہٗ نے اسی حقیقت کو اس طرح بیان فرمایا ہے۔

''چونکہ رسول اللہ ﷺ کو سیادت و پیشوائی و سرداری کا اعزاز اسی زمانہ میں عطا فرمایا جاچکا تھا حضرت آدم ابھی پانی اور کیچڑ میں (بین الماء والطین) میں تھے۔ اس سے یہ سمجھنا چاہیے کہ دنیا میں جو بھی کسی قانون اور آئین کے ساتھ اٹھایا گیا خواہ وہ قانون الٰہی ہو یعنی وحی پر اس کی بنیاد قائم ہو یا عقل و فکر کی راہ سے تیار ہوا ہو ہر ایک کو رسول اللہ ہی سے امداد ملتی رہی ہے۔ اور پہلا شخص (نہ کہ پہلی مخلوق مثلاً عرش ملائکہ، وغیرہ) جو اس امداد سے مستفید ہوا وہ حضرت آدم علیہ السلام ہیں (۸)۔

فیضانِ نور کے دوگونہ برکات

حضور اکرم ﷺ کے نورِ مبارک کے دو ظہوری آثار اور برکات ہیں، ایک حسی اور دوسرا معنوی، یا ایک ''صُوری'' اور دوسرا ''صدُوری''(۹)۔۔۔فیضانِ اول سے اشیا وجود میں آئیں جو ہم سب کی نگاہوں کے سامنے ہیں اور فیضانِ ثانوی سے انسانی سینوں کو ایمان اور معرفتِ الٰہی کی سیرابی نصیب ہوئی جو معنوی دولت ہے اور نگاہِ انسانی سے مستور ہے، حالانکہ یہی مطلوب و مقصود ہے اور اسی کے ثمرات جنت اور اس کی نعمتیں خصوصاً دیدار اور قریب الٰہی ہیں جن کا مشاہدہ آخرت ہی میں ہوگا۔

مذکورہ توضیح سے پتہ چلا کہ اصل فضیلت نورِ محمدی کے معنوی یا صدوری فیضان ہی کو حاصل ہے کیوں کہ گو وجودِ محض بھی عطائے ربانی ہی ہے مگر وجود بخشی کی غایت اور فیضانِ نوری کی تکمیلی فضیلت کا دار و مدار ایمان اور معرفت الٰہی کی یافت ہی پر ہے اور یہی صفت انسان کو تمام مخلوقات پر شرف بخشنے والی ہے۔

ایک اور بات سمجھنے کی یہ ہے کہ فیضانِ حسی متناہی اور محدود ہے کیوں کہ موجودات اپنی ذات کے اعتبار سے محدود ہیں مگر فیضانِ معنوی نامتناہی اور غیر محدود ہے چنانچہ اس کے ثمرات (قرب اور معرفتِ الٰہی) جو آخرت میں نصیب ہوں گے بے حساب ہوں گے۔

ہر وقت نیا طور نئی برقِ تجلی

ان حقائق سے آگاہ ہوکر یہ ماننا پڑتا ہے کہ محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے تخلیقِ نور کا ذکر گو سراسر بابرکت اور حضور پرنور کی عظمت اور بےنظیری کا معترف بنانے والا ہے مگر اس نورِ پاک کا فیضانِ معنوی یعنی ہدایت ربانی جو قرآن پاک اور اسوۂ محمدیہ کی صورت میں ہم تک پہنچا ہے اس کا ذکر اور شب و روز چرچا اصل مقصودِ حیات ہے اور جذبۂ احسان مندی کی انتہا ہے۔اور کامل محبت اور ادب سے جاری رہنا چاہیے (۱۰)۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر شریف یا حیاتِ نبوی کے چار ادوار

لکھا جاچکا ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی نوری تخلیق وہی روحی تخلیق بھی ہے کیوں کہ ختم نبوت کی خلعت اسی وقت پہنادی گئی تھی اس لیے حیاتِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کا نقطۂ آغاز یہی

آنِ مقدس قرار پائی ہے اور یہیں سے حیات نبوی کا دورِ اول شروع ہوتا ہے۔ جو عالمِ امر میں گذرا، اس کی طوالت کی پیمائش کون کر سکے؟ اگر اس حدیث شریف کو نظر میں رکھا جائے۔ جو پہلے نقل ہو چکی کہ تخلیقِ آدم سے چودہ ہزار برس پہلے حضور کی ولادت بہ شکل نور ہو چکی تھی، تو امری عالم کے ماہ و سال کا تعین کس طرح کیا جائے؟ آخرت والے دن پر قیاس کیا جائے تو ازروئے قرآن (۱۱)۔ ایک دن عالم ناسوت کے ایک ہزار برس کے برابر قرار پاتا ہے اس سے چودہ ہزار برس کا حساب لگایا جائے پھر بھی وہ حقیقی نہیں بلکہ محض قیاسی بات ہوگی۔ اس کے بعد عالمِ امر میں حضرت آدمؑ کی ولادت ہوئی، مسجودِ ملائکہ بنائے گئے ایک جنت میں رکھا گیا۔ جہاں وہ رہے جب تک بھی رہے، پھر ان سے لغزش کا صدور ہوا، معافی ملی اور خلافتِ ارضی کا منصب سونپ کر انہیں عالم ناسوت میں اتار گیا۔ اس دنیا میں حضرت آدم علیہ السلام کی تشریف آوری کے بعد سے حضور اکرم ﷺ ظہورِ قدسی (واقعہ فیل کے 50یا55) دن بعد 9یا 12 ربیع الاول دوشنبہ کی صبح 17جون 569ء (۱۲) تک کتنے ہزار برس گزر گئے اس کی اطلاع سے بھی مورخ عاجز ہیں، غرض یہی کہنا پڑتا ہے کہ حیات نبوی کا دورِ اول حضور کی تخلیقِ نور سے شروع ہو کر عالم ناسوت میں آپ کے ظہور پُر نور تک پھیلا ہوا ہے جس کی مدت ہمارے احاطۂ علمی سے بہت باہر ہے۔

عقل ایں جا ساکت آمد یا مضل

حیاتِ نبوی کا دورِ ثانی نگاہِ انسانی کے سامنے روز روشن کی طرح عیاں ہے جو حضور کی ولادتِ مبارکہ سے شروع ہو کر آپ کی اس دنیا سے پردہ فرمائی (دوشنبہ 12 ربیع الاول 10ھ، 8 جون 632ء) تک کا وہ مبارک ترین زمانہ ہے جو اس دنیا کو پہلے نصیب ہوا تھا نہ کبھی ہوگا۔ اسی تریسٹھ سالہ حیاتِ ناسوتی کو عرف عام میں حضور کی عمر شریف کہا جاتا ہے جو درحقیقت آپ کی عمر کا سب سے مختصر دور ہے۔

حیات نبوی کا تیسرا دور حضور انور ﷺ کی وفات شریف کے بعد سے یوم حشر تک کا متعین ہوتا ہے اس کی مدت بھی نہ معلوم ہے نہ معلوم کی جاسکتی ہے۔ ''یہ حیاتِ

برزخی ہے اور اتنی قوی ہے کہ حیاتِ ناسوتی کے قریب ترین ہے چنانچہ بہت سے احکام ناسوت کے اس پر متفرع بھی ہیں'' (۱۳)۔

حیات نبوی کا چوتھا دور حشر کے بعد کا دورِ آخرت ہے جس کی کوئی انتہاء نہیں یہ وطن اصل میں پہنچ جانا ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون کی حقیقت کا حصول ہے (۱۴)۔

(یہ حیاتِ نامتناہی حضور اکرم ﷺ کے صدقے میں ہر اس آدم زاد کو ملے گی جس کے ایمان کی شہادت حشر کے دن راست یا بواسطہ انبیاء علیہم السلام حضور ﷺ عطا فرمائیں گے۔

حضور ﷺ کی حیاتِ ناسوتی کی عظمت و اہمیت

سرکارِ دو عالم ﷺ کی تریسٹھ سالہ ناسوتی حیات کی خصوصی عظمت و اہمیت کے لیے یہی ایک ثبوت کافی ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس دورِ عمر کی قسم کھائی ہے کہ

لعمرانهم لفی سکرتهم یعمهون (الحجر۷۲)

آپ ﷺ کی حیات اور جان کی قسم وہ (قوم لوط) اپنی مستی اور نشہ میں بھٹک رہے ہیں۔

حق تعالیٰ جب کسی شے کی قسم کھاتے ہیں تو اس کا منشا یا تو اس شے کی عظمت کو ظاہر کرنا ہوتا ہے یا خود اس شے کو گواہ ٹھہرانا ہوتا ہے اور کبھی بہ یک وقت یہ دونوں مقصود ہوتی ہیں، یہاں قسم میں دونوں پہلو جمع ہیں۔ حضور ﷺ کی حیاتِ مبارکہ کی عظمت کہ اس جیسی روشن، جامع، کامل، ہمہ گیر، عملی، محیطِ حیات اور قابلِ اتباع زندگی نہ آپ سے پہلے چشم فلک نے دیکھی تھی، نہ آئندہ پاسکے گی اور حیاتِ مقدسہ کی اہمیت کہ یہ بے مثل و بے نظیر ہستی کی زندگی ہے جس کے نقش قدم سے صراطِ مستقیم کا تعین ہوتا ہے۔ جس کے وسیلے سے خدا ملتا اور جس کی پیروی کے بغیر نگاہ حق میں محبوبیت حاصل ہو ہی نہیں سکتی ہے۔

پندار سعدی کہ راہِ صفا

توان رفت جز در پے مصطفا

غرض ایسی عظیم واہم ترین ہستی کی بعثت کو اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان پر اپنا احسانِ عظیم قرار دیا۔ اور تاکیدِ مکرر (یعنی ل اور قد) کے ساتھ ارشاد فرمایا:

لقد من الله علی المومنین اذبعث فیھم رسولا من انفسھم (آل عمران ۱۶۲)

یقیناً، یقیناً ہم نے اہل ایمان پر احسان کیا کہ ان میں ایک رسول ان ہی کی جنس سے برپا کیا۔

وجہ اس کی یہ ہے کہ جب تک ہم عالمِ ارواح میں رہے قربِ الٰہی سے فیضیاب، دیدارِ الٰہی سے سرشار اور ہم کلامی سے مشرف رہے مگر جب عالمِ ناسوت میں آگئے تو نہ اپنا وطن اصلی یاد رہا، نہ اپنا اللہ، عشق و محبت کا محور، جس سے بندگی اور عہدِ واثق کیا تھا، یاد رہا نہ اس عالم نورانی کی لطافتیں یاد رہیں۔ تو بر تو حجابات میں آگئے، نفس کے گرفتار ہوکر اس کی شہوات اور لذات کے دلدل میں پھنس گئے، اپنی فطرت کے بنیادی سوالات یعنی ہم کہاں سے آئے؟ کیوں آئے؟ کہاں جائیں گے؟ ہماری اس زندگی کا مقصد کیا ہے؟ اپنے باہر (آفاق کو) دیکھ کر یہ سوالات ابھرتے ہیں

لالہ و گل کہاں سے آئے ہیں؟
ابر کیا چیز ہے، ہوا کیا ہے؟
یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں؟
غمزدہ و عشوہ و ادا کیا ہے؟

(غالب)

اور اپنے اندر جھانک کر یہ کہ:

اگر کوئی شے نہیں ہے پنہاں تو کیوں سراپا تلاش ہوں میں؟
نگہ کو نظارے کی تمنا ہے، دل کو سودا ہے جستجو کا

ان سوالات کا کوئی جواب نہ تھا اور کس سے پاتے کہ سب عقل و حواس کے

دائرے میں محبوس ہیں، محصور ہیں، مجبور ہیں اور یہاں تلاش ہے ماورائے حواس حقائق کی،
لے دے کر فلسفی ملا جو ان سوالات کے جوابات کا مدعی تھا، مگر اس کے ہر جواب سے
اشکالات کے دروازے کھلتے گئے اس لیے کہ وہ حقائق سے آگاہ نہ تھا بلکہ محض عقلِ نارسا
کی قوتِ قیاسیہ کے بل بوتے اٹکل پچو جوابات دے رہا تھا، نتیجہ یہ کہ اس کے ہر سلجھاؤ سے
الجھاؤ اور اس کے ہر دلاسے سے اضطراب بڑھتا رہا

فلسفی سرِّ حقیقت نہ نتوانست کشود
گشت رازِ دگر آں راز کہ اِفشاء می کرد

(شبلی)

حیات کے ناسوتی چوراہے پر بھٹکنے والی انسانیت کی رہنمائی صرف وہی کرسکتا تھا
جو یہاں پہنچ کر بھی اللہ سے واصل اور مخلوق میں شامل ہو، جو ادھر سے لے اور ادھر دے
ایسی ہستیاں صرف انبیاء علیہم السلام کی ہیں جن کو خود ذاتِ حق خاص اسی کام کے لیے منتخب
کرتی اور زمین میں بھیجتی رہی، پس گم گشتہ اور منزل فراموش انسانیت پر حق تعالیٰ جل جلالہ
کا سب سے بڑا احسان ان ہی ہستیوں کی بعثت ہے(۱۵)۔اور چونکہ ہدایت ربانی کے
احسان کا بدرجہ کمال اتمام ہمارے آقا محمد مکی مدنی (فداہ امی و ابی)ﷺ کی ذاتِ اقدس
سے ہوا، اس لیے آپ بلا شرکتِ غیر اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف سے انسانیت کے محسن
عظیم ٹھہرے۔

اور گو ہم اپنی وجود یابی میں اور اقرارِ الست (۱۶) میں حضور اکرم ﷺ ہی کے
منت پذیر ہیں مگر عالم ناسوت کی تاریکیوں میں گھر کر خدا ناشناسی اور خود فراموشی میں مبتلا
ہوکر اپنی پچھلی حیات کو اکارت اور اگلی حیات کر برباد کر بیٹھے اس لے ایسی ضلالت اور
موقفِ ہلاکت میں حضور انور ﷺ کی حیات ناسوتی چونکہ رہتی دنیا تک کے لیے تابناک
مثالی نمونۂ حیات بنائی گئی ہے اس لیے لامحالہ اس دورِ حیات کی عظمت و اہمیت بڑھ گئی ہے
اس لیے اللہ پاک نے اس حصۂ عمر کی قسم اٹھا کر اس کی عظمت و اہمیت کو عالم آشکار فرمایا
ہے (۱۷)۔

آقائے دو عالم ﷺ کی شانِ عظمت

کیا عزت و توقیر ہے آقائے دو عالم ﷺ کی کہ وحی الٰہی اہل امت کو متنبہ کررہی ہے کہ ہوشیار خبردار کہ

النبی اولیٰ بالمومنین من انفسھم و ازواجه امھتھم

(الاحزاب ۶)

النبی (محمد رسول اللہ ﷺ) تو اہل ایمان کی اپنی جانوں پر بھی فوقیت رکھتا ہے اور اس کی بیویاں ان (مومنین) کی مائیں ہیں۔

''جانوں پر فوقیت'' کی تشریح جو شاہ عبدالعزیز دہلوی قدس سرہٗ نے فرمائی ہے وہ نہایت توجہ طلب ہے فرماتے ہیں:

''نبی نائب ہے اللہ کا، اپنی جان و مال میں اپنا تصرف نہیں چلتا جتنا نبی کا چلتا ہے۔ اپنی جان دہکتی آگ میں ڈالنا روا نہیں اگر نبی حکم دے تو فرض ہوجائے۔ انہی حقائق پر نظر کرتے ہوئے احادیث میں فرمایا کہ تم میں کوئی آدمی مومن نہیں ہوسکتا جب تک میں اس کے نزدیک باپ بیٹے بلکہ سب آدمیوں بلکہ اس کی جان سے بھی بڑھ کر محبوب نہ ہوجاؤں'' (۱۸)۔

اس ذیل میں صفِ اول کے عاشقانِ محمدی ﷺ کے احوال کی ایک مثال ہمارے حضرت شیخ نور اللہ مرقدہ کی زبان سے سنیئے فرماتے ہیں:

''احد کے مشہود معرکہ میں جب قریش کے تیغ زنوں نے آپ ﷺ پر یورش کی اور مسلمانوں کی صفیں درہم برہم ہوئیں تو آپ ﷺ نے آواز دی کہ کون مجھ پر جان دیتا ہے؟ اس آواز کو سن کر دفعتہ سات انصاری نکل آئے اور ایک ایک نے جانبازی سے لڑ کر جانیں فدا کردیں ایک انصاری خاتون کے باپ بھائی اور شوہر، تین پیاری جانیں اس معرکہ میں تصدق ہوئیں، باری باری تین سخت حادثوں کی صدائیں اس کے کانوں میں پڑتی

ہیں اور وہ ہر بار صرف یہ پوچھتی جاتی ہے کہ وہ جانِ عالم رسول ﷺ کیسے ہیں؟ لوگوں نے کہا کی بخیر ہیں۔ اس نے پاس آکر چہرہ مبارک دیکھا اور بے اختیار پکار اٹھی کل

مصیبة بعدك جلل یا رسول اللہ تیرے ہوتے سب مصیبتیں ہیچ ہیں

میں بھی اور باپ بھی شوہر بھی برادر بھی فدا

اے شہِ دیں ترے ہوتے ہوئے کیا چیز ہیں ہم (۱۹)

درج بالا آیتِ شریفہ میں ایک اور بات قابل غور ہے وہ یہ کہ سرورِ عالم ﷺ اور آپ کی ازواجِ مطہرات کی شانِ عظمت کا ذکر ایک خاص فرق سے کیا گیا، یہ ازواجِ مطہرات کی فضیلت کو نسبتِ مادری قائم کر کے بیان کیا گیا ہے کہ وہ اہل ایمان کی مائیں ہیں اور دوسری آیت میں مزید صراحت کی گئی کہ اہل ایمان کبھی بھی ان سے ازدواجی رشتہ کا تصور اپنے ذہن میں نہ لائیں۔

مگر سرکارِ دو عالم ﷺ کے لیے آپ کی شانِ عظمت کے اظہار میں نسبت "پدری" یا اور کوئی نسبت جو انسانی معاشرے میں اعلیٰ منزلت رکھتی ہو اختیار نہیں کی گئی بلکہ پدری نسبت کی نفی تو خود اسی سورہ کی آیت نمبر ۴۰ میں فرمادی گئی کہ

ما کان محمد ابا احد من رجالکم

محمد تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں۔

بلکہ اہل ایمان کی جانوں پر آپ کی برتری اور تو فق کو واجب قرار دیا گیا، اس سے معلوم ہوا کہ گو ازواجِ مطہرات بھی بڑی منزلت کی حامل ہیں مگر حضور اقدس ﷺ کی شانِ عظمت سب سے سوا اور سب سے مافوق ہے۔

ایک اور آیت کریمہ میں آقائے دو عالم ﷺ کی توقیر و تعظیم کو بڑے دل آویز اسلوب میں بیان کیا گیا ہے۔ سورہ اعراف کی آیت نمبر ۱۵۷ میں پہلے حضور اکرم ﷺ کے چند در چند احسانات گنائے گئے ہیں کہ آپؐ تو وہ ہیں کہ لوگوں کو نیکیوں کی راہ پر لگاتے اور

برے کاموں سے بچاتے ہیں۔آپ ہی کے طفیل پاک چیزوں کے حلال اور ناپاک چیزوں کے حرام ہونے کی تمیز حاصل ہوئی اور آپ ہی نے کفر وشرک کے بوجھ سے دبی ہوئی اور جہالت و ضلالت کی بندشوں میں جکڑی ہوئی انسانیت کو رہائی عطا فرمائی، لہذا ایسے محسنِ انسانیت کا اہل ایمان پر یہ حق واجب ٹھہرتا ہے کہ وہ آپ کی تعظیم کریں ارشاد ہے۔

وعزروہ ونصروہ واتبعوا النور الذی انزل معہ اولٰئک ھم المفلحون (اعراف ۱۵۷)

اور تعظیم کی ان کی اور نصرت کی ان کی اور پیروی کی اس نور کی جو اتار گیا ان کے ساتھ۔ یہی لوگ نجات پانے والے ہیں۔

''اس سے صاف ظاہر ہے کہ بغیر آنحضرت ﷺ کی تعظیم کے نجات بھی ممکن نہیں، کیوں کہ اہل بلاغت جانتے ہیں کہ ترکیب اولئک ھم المفلحون حصر کے لیے ہے یعنی رستگاری اور نجات خاص انھیں لوگوں کو ہے جن میں یہ سب صفات موجود ہوں اسی وجہ سے عظمت وہیبت آنحضرت ﷺ کی صحابہ کے دلوں پر کچھ ایسی مستولی تھی کہ باوجود (آپ ﷺ کے) اس خلق عظیم کے جس سے جانی دشمن حلقہ بگوش اور وحشی صفت بے گانے مانوس ہوجاتے تھے اور باوجود اس کمالِ عشق و محبت کے صحابہ آنکھ بھر کر چہرۂ مبارک کو نہیں دیکھ سکتے تھے۔اور کسی میں یہ جرأت نہ تھی کہ کوئی بات یا مسئلہ بے تکلف پوچھ لے۔ اجنبی جہاں دیدہ لوگ صحابہؓ کی تعظیم توقیر اور خدمت گزاری کو جب دیکھتے بلاتصنع آپس میں کہتے کہ اس قسم کی تعظیم نہ کسی بادشاہ کی ہوتی دیکھی نہ کسی اور کی۔'' (۲۰)

قرآن پاک نے حضور ﷺ کی شان عظمت ہی کے اظہار پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اس کے تقاضے کی تعمیل پر بڑی شدت سے زور دیا۔ تاکہ شانِ عظمت کی جلالت خوب ظاہر ہو جائے سورہ النساء کی آیت 65 میں اہل ایمان کو خبردار کیا گیا ہے کہ حضور ﷺ کی عظمت شناسی کا تقاضہ یہ ہے کہ اپنی چاہت کو حضور ﷺ کی چاہت پر بخوشی قربان کردیں اور اس قربانی سے اپنی دل میں ادنیٰ ناگواری کا اثر پیدا نہ ہونے دیں۔ ارشاد ہے۔

فلا وربك لا يومنون حتى يحكموك فيما شجر بينهم ثم لا يجدو في انفسهم حرجا مما قضيت و يسلمو تسليما

قسم ہے آپ کے رب کی یہ صاحب ایمان نہ ہوں گے جب تک اپنے جھگڑوں میں آپ کو حکم نہ بنائیں پھر آپ کے فیصلہ پر اپنے جی میں کوئی تنگی نہ پائیں (بلکہ) اس کو تسلیم کرلیں بہ رضا و رغبت۔

یعنی جس فریق کے خلاف آپ کا فیصلہ پڑے وہ بھی اسی کو صحیح و بجا سمجھ کر اپنے دل کو ملامت کرے کہ وہ کس غلط ادعا کو لیے ہوئے تھا، سرکار دو عالم ﷺ کا احسان ہے کہ ان کے فیصلہ سے حق کھل گیا اور غلطی سے نجات میسر آئی۔

انتباہ! گو دل کی کیفیات بے اختیاری ہیں مگر جذبات پر عقل کو غالب رکھنے سے ان کو فوراً بدلا جاسکتا ہے اسی لیے اس کا مکلّف ٹھہرا گیا ہے خوب سمجھ لیجئے اور اس نسخہ کو برت کر اس کی شفا بخشی کا یقین حاصل کیجئے۔

آخر میں ایک بات اور منصبِ نبوت چونکہ منصبِ ادعا ہے اس لیے نبی خود بھی اپنی شان کے اظہار میں تکلف سے کام نہیں لیتا۔ بلکہ اس کا یہ اظہار امتیوں کے لیے باعثِ رحمت ہوتا ہے۔ چنانچہ رحمۃ اللعالمین ﷺ نے بھی اپنی عظمت اپنی سرداری اور ساری مخلوقات میں سب پر برتری کا کئی پیرائے میں اظہار فرمایا، یہاں صرف دو نہایت مختصر مگر پرشوکت ارشادات مصطفوی بطور نمونہ ملاحظہ ہوں ارشاد ہے:

انا سید ولد آدم ولا فخر (۲۱)

یعنی یہ بات از راہِ تفاخر نہیں ہے بلکہ ایک امر واقعہ ہے کہ میں اولادِ آدم کا سردار اور پیشوا ہوں، انبیاء ہوں کہ غیر انبیاء سب میرے تابع ہیں۔

اعطیت جوامع الکلم (۲۲)

یعنی میرے تکلم میں وہ جامعیت رکھی گئی ہے جو کسی اور بشر کو عطا نہیں کی گئی

ہے۔ یہ جامعیت نہ صرف لفظی نہ صرف معنوی اور نہ صرف اثر انگیزی کے اعتبار سے ہے بلکہ عالم ارواح اور عالم ناسوت کے فیضانِ جامع والی وسعت کی جہت سے بھی ہے اسرار و حقائق کے پردہ کشا حضرت شیخ اکبر قدس سرہٗ فتوحاتِ مکیہ میں تحریر فرماتے ہیں، کہ ''حضرت آدم کو اسماء کے علم میں رسول اللہ ﷺ نے اپنی خصوصیت سے امداد فرمائی تھی جس کا اظہار اعطیت جوامع الکلم کے الفاظ میں فرمایا ہے'' ۲۳؎

خیر البشر صاحبِ کوثر ﷺ کا مقامِ محبوبیت

سید و سرور خیر البشر صاحب کوثر ﷺ کی عند اللہ خاص الخاص محبوبیت کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ آپ ﷺ کی محبت ہم امتیوں کے لیے شرط ایمان قرار دی گئی ہے خود محبوب رب العالمین کا کس قدر پر زور انتباہی ارشاد ہے:

والذی نفسی بیدہ لا یومن احد کم حتی اکون احب الیہ من والدہ و ولدہ والناس اجمعین (۲۴)

اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ تم میں سے کوئی صاحب ایمان نہیں ہوسکتا جب تک کہ میں اس کے نزدیک اس کے باپ اور اس کی اولاد اور تمام لوگوں سے زیادہ عزیز نہ ہو جاؤں۔

باالفاظ دیگر محمد عربی (فداہ ابی وامی) حق تعالیٰ کو اس قدر محبوب ہیں کہ جس کے دل میں ان کی محبت اپنی ہر شے سے زیادہ موجود نہ ہو وہ اللہ کی نگاہ میں صاحب ایمان نہیں ہے خواہ وہ اپنے زعم میں کیسا ہی مدعی ایمان کیوں نہ ہو۔

حضور ﷺ کی محبوبیت کبریٰ کی دوسری بڑی شہادت یہ ہے کہ ''حضور کی صفت میں وہ دو نام بحالت ترکیبی تجویز فرمائے گئے ہیں جو اسی ترتیب کے ساتھ ذات پاک سبحانی تعالیٰ کے لیے مستعمل ہوئے ہیں یعنی رؤف رحیم قرآن پاک کی آیت

بالمومنین روف رحیم (توبہ ۱۱۸)

آپ ﷺ اہل ایمان پر شفیق اور مہربان ہیں۔

آیت بالا میں حضور ﷺ کی رافت و رحیمیت کو اہل ایمان کے ساتھ خاص بتلایا گیا ہے جب کہ ذات باری تعالیٰ کی رافت و رحیمیت عام ہے۔ بہر کیف ان دو اسماء کے علاوہ بھی جو صاف قرآن پاک میں آئے ہیں، محققین نے اَسّی سے زائد ایسے اسماء محمدی گنائے ہیں جن کی مواقفت اور مطابقت اسمائے الٰہیہ سے ہوتی ہے۔ اور یہ ذوق متاخرین ہی کا نہیں ہے بلکہ دربارِ نبوی کے شاعر خاص (Poet Lauriat) جن کو خود سرکار نبوی سے موید بہ روح القدس ہونے کی سند حاصل تھی، ان سے بھی اس ذوق کی تائید ملتی ہے، حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

وشق لہ من اسمہ لیجلہ

فذو العرش محمود وھذا محمد

یعنی حق تعالیٰ شانہ نے آپ ﷺ کی عزت افزائی کی خاطر آپ ﷺ کا نام اپنے نام سے نکالا ہے چنانچہ وہ عرش والا تو محمود ہے اور یہ (ہمارے حضور ﷺ محمد ہیں۔

ان حقائق سے حضور ﷺ کی محبوبیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے اور محسوس کیا جاسکتا ہے کہ محبوبِ ازل جل مجدہ نے اپنے نبی محبوب ﷺ کو اپنے آغوشِ قرب میں لے رکھا ہے جو انہیں کے لیے خاص ہے۔

اس کے علاوہ قرآن پاک میں جابجا حضور اکرم ﷺ کی دلداری، خوشنودی اور پاسِ خاطر مبارک کا اظہار موجود ہے جو آپ کی انتہائی محبوبیت پر دلالت کرتا ہے۔ نمونہ چند ایسی آیات درج ذیل ہیں:

دیکھئے حضور ﷺ کی محبوبیت کا یہ عالم ہے کہ خود رب محمد آپ کی حیات اور آپ کی جان کی قسم کھا رہا ہے۔

لعمرک انھم لفی سکرتھم یعمھون (الحجر ۷۲)

آپ کی حیات اور جان کی قسم وہ (قوم لوط والے) اپنی مستی اور نشہ

میں بھٹک رہے ہیں۔

پھر آپ کے شہر کی قسم کھا رہا ہے۔

لا اقسم بھذا البلد (البلد ۱)

قسم کھاتا ہوں اس شہر (مکہ) کی

پھر دیکھئے کہ آپ حبیب ﷺ کا پاس خاطر کس قدر ملحوظ ہے کہ مثلاً حضور ﷺ کا جی چاہتا تھا کہ بیت المقدس کے بجائے بیت اللہ دائمی قبلہ بن جائے فوراً وحی الٰہی آ گئی اور کس اسلوب دلربائی کے ساتھ

قد نری تقلب وجھک فی السماء فلنولینک قبلۃ ترضا ھا فول وجھک شطر المسجد الحرام

ہم آپ کے چہرہ کا بار بار آسمان کی طرف اٹھنا دیکھ رہے ہیں پس ہم آپ کو اپنی مرضی کے قبلہ کی طرف پھیر دیں گے۔ اب پھیریئے منہ مسجد حرام کی طرف (البقرہ ۱۴۴)۔

حرا کی پر لذت خلوت آرائی کے بعد حضور ﷺ کو جب اپنے منصبِ نبوت کے اظہار کا حکم ہوا اور دعوت اسلام کے فریضہ کی طرف متوجہ ہونا پڑا تو یہ چیز آپ ﷺ کے طبع مبارک پر ایک بوجھ محسوس ہونے لگی، ادھر اہل قریش کی مخالفت اور طنز و تشنیع بھی بارِ خاطر بن گئی، رحمتِ حق نے اپنے محبوب کی فوراً دستگیری فرمائی اور کیفیت قلبیہ ایسی ہو گئی کہ مخلوق کی طرف توجہ توجہ حق میں بالکل حارج نہیں رہی اور اس کے ساتھ ہی یہ مژدہ بھی سنایا گیا کہ بول بالا تو صرف آپ کا ہوگا مخالف آوازیں سب گم ہو کر رہ جائیں گی وحی آئی۔

الم نشرح لک صدرک ورفعنا لک ذکرک

(الم نشرح: ۱ اور ۴)

کیا ہم نے کھول نہیں دیا آپ کی خاطر آپ کے سینہ کو اور بلند کر دیا آپ کی خاطر آپ کے ذکر کو۔

ان دونوں آیات میں لک کا لفظ کس محبوبیت کی نشاندہی کر رہا ہے کہ شرح صدر اور رفع ذکر کی نعمتیں ہم نے صرف آپ کی دلجوئی اور پاس خاطر کے لیے عطا کی ہیں۔

رشتہ محبت کی نزاکت اور احترام اور تحسین غیر سے بے نیازی کا اندازہ اس سے لگایئے کہ منافقین نے حضور اکرم ﷺ کی رسالت کی جھوٹے منہ تصدیق کی ذات عالم الغیب اس جھوٹی تصدیق کی گستاخی کو برداشت نہ کر سکی اور وحی کے ذریعے یہ منادی کرادی کہ محمد مصطفیٰ ﷺ ایسی جھوٹی گواہیوں کے محتاج نہیں بلکہ کسی کی بھی گواہی کے محتاج نہیں کیوں کہ ذات حق خود حضور ﷺ کے اس منصب پر گواہ ہے۔

اذا جنك المنفقون قالو نشهد انك لرسول الله والله يعلم انك لرسوله والله يشهد ان المنافقين لكذبون

جب یہ منافقین آپ ﷺ کے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم گواہ ہیں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں ہاں اللہ کو خوب علم ہے کہ آپ ﷺ اس کے رسول ہیں اور اللہ شاہد ہے کہ یہ منافقین قطعی جھوٹے ہیں۔ (المنافقون :۱)

یہ تو معلوم ہے کہ سارا عالم رضائے الٰہی کا طالب ہے اور یہ بھی مسلم ہے کہ طالبانِ رضائے حق کے پیشوا آقائے دوجہاں ﷺ ہیں مگر ہمارے پیشوا کا امتیاز یہ ہے کہ خود حق تعالیٰ کو بھی ان کی رضا اور خوشنودی مطلوب ہے۔ حضور اکرم ﷺ کو اپنی امت کی فکر اور اس کی بخشائش کا خیال مغموم و محزون بنائے رکھتا تھا۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے آپ کو مطمئن فرما دیا کہ عنقریب ہم آپ کو اذنِ شفاعت اتنا دیں گے کہ آپ راضی اور مطمئن ہو جائیں گے، سورۂ والضحیٰ میں ارشاد ربانی ہے۔

وَلَسوف يعطيك ربك فترضىٰ (والضحیٰ 5)

اور عنقریب آپ کا رب آپ کو اتنا دے گا کہ آپ خوش اور مطمئن ہو جائیں گے۔

حضورﷺ کی اس شانِ محبوبیت کا سعدی شیرازی قدس سرہٗ نے کس والہانہ پیرائے میں اظہار فرمایا ہے(۲۵)۔

ہمہ عالم رضائے حق جوید
حق رضائے تو یا رسول اللہ

تبّرکاتِ نبوی کی صحابہ کرام میں والہانہ تعظیم وتوقیر

قاضی عیاضؒ نے اپنی تالیف شفا میں لکھا ہے کہ حضور اکرمﷺ کے حق تعظیم میں سے یہ بھی ہے کہ آپ سے تعلق رکھنے والی ہر چیز کی تعظیم کی جائے، جس جگہ آپ تشریف لے گئے ہیں اس جگہ کا احترام اکرام کیا جائے۔ مکہ مکرمہ اور مدینہ طیبہ میں جن مکانات کوآپ سے کسی قسم کا انتساب رہا ہے ان کی تعظیم کی جائے جن چیزوں کوآپ کے جسد اطہر سے مس رہا ہے ان کی توقیر کی جائے۔ بطورِمثال حضرت خالد بن ولیدﷺ کا واقعہ نقل کیا ہے بعض لڑائیوں میں دورانِ قتال ان کی کلاہ سر سے گر پڑی تو اس قدر بے جگری سے لڑنے لگے کہ بہت سوں کو تہ تیغ کردیا بعد کو جب حضرات صحابہ نے تعجب سے پوچھا تو حضرت خالد نے فرمایا کہ یہ محض اپنی کلاہ کے لیے نہیں تھا بلکہ اس میں حضور اکرم ﷺ کے موئے مبارک تھے، ان کے تحفظ کی خاطر تھا تاکہ میں ان کی برکت سے محروم نہ رہ جاؤں اور یہ مبارک بال کافروں کے ناپاک ہاتھوں میں نہ پہنچ جائیں۔

حواشی

۱۔ شہد اللہ انہ لاالہ الاھو۔ (آل عمران 18)

۲۔ کنت کنز مخفیاً فاحببت ان اعرف فخلقت الخلق لا عرف، اس حدیث قدسی کو حافظ سخاویؒ نے بعض الفاظ کی کمی بیشی سے ''مقاصد حسنہ'' میں نقل فرمایا ہے اور علی قاری فرماتے ہیں کہ اس حدیث کے معنی حق تعالیٰ کے اس ارشاد کے

مطابق ہیں۔ وما خلقت الجن والانس الا یعبدون (یعنی لیعرفون) الذاریات 56)

۳۔ انما امرہ اذا اراداء شیئا ان یقول لہ کن فیکون (یاسین 86)

۴۔ بہ روایت علی بن حسن عن حسین بن علی عن علی کرم اللہ وجہہ بحوالہ احکام ابن القصان بہ روایت ابن مروزق (ملاحظہ ہو نشر الطیب پہلی فصل)

۵۔ بروایت ترمذی، اور ایسے ہی الفاظ میسرہ نسبی کی روایت میں بھی آئے ہیں۔ امام احمد اور بخاری نے اپنی تاریخ میں اور ابو نعیم نے حلیہ میں اس کو روایت کیا ہے اور حاکم نے اس کی تصحیح کی ہے۔(نشر الطیب پہلی فصل)

۶۔ بروایت عریاضؓ روایت کیا اس کو احمد اور بیہقی نے اور حاکم نے س کو صحیح الاسناد بھی کہا ہے(نشر الطیب پہلی فصل)

۷۔ ترجمہ: تمام انبیاء علیہم السلام حضور اکرم ﷺ سے ملتجی ہیں (فیضانِ محمدی کے دریا سے) ایک چلو اور ایک گھونٹ کے لیے۔

۸۔ یہ اردو زبان میں ترجمانی ہمارے استاد گرامی حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی نور اللہ مرقدہ کے قلم سے۔ دیکھو مجالس شیخ اکبر زیرِ عنوان ''سیادت رسول اکرم'' مشمولہ مقالات احسانی (مصنفہ حضرت گیلانی) ص 359 شائع کردہ مجلس علمی، کراچی۔

۹۔ ''صدوری'' یعنی صدر سے متعلق اور صدر کے معنی ہیں ''سینہ'' جس سے اصل مقصود قلبِ انسانی ہے جو ایمان و معرفت کا گھر ہے۔

۱۰۔ یہ پوری تقریر حضرت حکیم الامۃ مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ کی ہے جس کو راقم الحروف نے اپنی زبان میں عام فہم کرنے کی کوشش کی ہے ماخوذ از وعظ الحبور الصدور''

۱۱۔ فی یوم کان مقدارہ الف سنہ مما تعدون (السجدہ 5)

۱۲۔ ترجمہ: ایک دن میں جس کا پیمانہ ہزار برس ہے۔

عام طور پر سنہ عیسوی 571 مہینہ اپریل اور تاریخ 26 لکھا جاتا رہا مگر اب دور حاضر کے مسلم محقق ڈاکٹر محمد حمید اللہ نکے اس کی تصحیح فرمائی ہے کہ یہ تاریخ 17 جون 569 عیسوی آتی ہے۔

۱۳۔ دیکھو وعظ ''الطہور'' (حضرت تھانوی قدس سرہٗ)

۱۴۔ عمرِ نبوی کی یہ چار ادواری تقسیم حضرت مولانا تھانوی قدس سرہٗ کے وعظ ''الطہور'' سے ماخوذ ہے۔

۱۵۔ چنانچہ حضرت ابی ابن کعب کی متصل روایت کے آخری الفاظ یہ ہیں کہ ''میں تمہارے پاس اپنے پیغمبر بھیجوں گا جو تم کو یہ عہد (الست) جو تم میرے ساتھ کر رہے ہو یاد دلائیں گے اور تم پر اپنی کتابیں بھی نازل کروں گا۔ تفہیم القرآن)

۱۶۔ عالم ارواح میں جب الست کا عہد لیا گیا اور پوچھا گیا الست بربکم تو سب نے حضور کی طرف دیکھا کہ دیکھیں آپ کیا جواب دیتے ہیں؟ تو سب سے اول حضور نے جواب دیا بلیٰ و انت ربنا اور اس کے بعد اوروں نے بلیٰ کہا (حضرت اقدس تھانوی وعظ ''ظہور'')

۱۷۔ یعنی اے مخاطب نصاریٰ نے جس طرح عیسیٰ علیہ السلام کو ان کے اظہار عظمت میں ابن اللہ کہا تھا تو اپنے آقا ﷺ کے بارے میں یہ تو نہ کہہ بلکہ آپ کو افضل العباد سمجھتے ہوئے آپ کی تعریف و توصیف میں جس وصف کمال کا تیرا جی چاہیے خوب مضبوطی اور قوت سے دعویٰ کر کہ نہ آپ کی عبدیت کاملہ کی نفی نہ ہو آپ کسی بشر کے برابر ٹھہریں۔

۱۸۔ تفسیری حواشی از مولانا شبیر احمد عثمانی نور اللہ مرقدہ

۱۹۔ خطبات مدراس خطبہ ''کاملیت''

۲۰۔ انوار احمدی مصنفہ حضرت علامہ محمد انوار اللہ (فضیلت جنگ) استاد نظام سابع حیدر آباد نور اللہ مرقدہ زیر عنوان ''ادب تعظیم و توقیر''

۱۲۔ صحیح مسلم برروایت ابو ہریرہؓ

۲۲۔ صحین بروایت ابو ہریرہؓ

۲۳۔ مقالاتِ احسانی مصنفہ مولانا سید مناظر احسن گیلانی، مجالس شیخ اکبر قدس سرہ زیر عنوان ''سیادت رسول اکرم ﷺ ص 360 (مطبوعہ مجلس علمی کراچی)

۲۴۔ صحیح بخاری بروایات ابو ہریرہ وانس رضی اللہ عنہما

۲۵۔ نعت کا مطلع اور مقطع یہ ہے

جاں فدائے تو یا رسول اللہ　　دل گدائے تو یارسول اللہ

سر نہاد ست بردرت سعدی　　در ولائے تو یارسول اللہ

دعوت دین کا پیغمبرانہ اسلوب

خوب ذہن میں رہے کہ ہمیں پیغمبرانہ دعوت کے اصول نہیں بلکہ اس کے اسلوب کو سمجھنا ہے۔ عربی و فارسی لغت کے اعتبار سے ''اسلوب'' کے معنے ہیں وضع، طرز اور روش، لہذا ہمیں دیکھنا ہے کہ ''پیغمبر خاتم ﷺ نے نوعیت اور ہمہ گیری کے اعتبار سے تیس ۲۳ برس کی قلیل مدت میں، دین اسلام کو ادیانِ عالم پر جو غالب کر دکھایا اور ایک ایسی اسلامی مملکت قائم فرمادی جس نے قیصر و کسریٰ کی طاقتوں کو لرزا دیا، تو اس ساری کاوش میں آپ کا اسلوب کار کیا رہا؟ کونسا راستہ آپ کے طرز عمل سے ابھر آیا؟
وما ارسلناک الارحمۃ اللعالمین کی نصِ قرآنی یہ رمز کشائی کررہی ہے کہ پیغمبرانہ اسلوبِ دعوت کی دولفظی تعبیر ''اسلوبِ رحمت'' ہے۔ مگر جس طرح حضورؐ کا اسم گرامی محمد تخلیق الٰہی کے سارے جمال و کمال کی انتہایوں کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے، اسی طرح اسلوب رحمت کے دولفظوں میں آپ کی دعوت کی ساری حکمتیں اور آپ کے قلب اطہر کے سارے داعیات اور محرکات کی لطافتیں جمع ہوگئی ہیں اور اس اعجاز کے ساتھ کہ مثل حسنك ما رأيتا کی دلربائی اور جاذبیت پیدا ہوگئی ہے۔

حضور اکرم ﷺ کے ماسبق انبیاء علیہم السلام کے بالمقابل آپ کی دعوت چونکہ عالمگیر بھی ہے اور اس کو قیامت تک رہنا بھی ہے، اس لیے آپ کے اعلان نبوت کے بعد سب انبیاء کے پیغامات منسوخ اور ہدایت کا ہر چراغ بجھ چکا ہے اب تو ساری انسانیت پر صرف محمد عربی فداہ ابی وامی کا رج ہے ہر طرف ان ہی کا دور دورہ ہے، اور اسی لیے لامحالہ ساری انسانیت اب صرف آپ ہی کی امت ہے، چاہے افراد امت آپ کے مانیں یا نہ مانیں۔ فرق یہ پیدا رہے گا کہ ماننے والے ''امت اجابت'' کہلائیں گے اور آپ کے مستحق شفاعت رہیں گے اور نہ ماننے والوں کا گروہ یا طبقہ امت دعوت متصور ہوگا۔ یعنی

امت کا ایسا حصہ یا طبقہ جس پر دعوت و تبلیغ کا کام جاری رکھنا ہے۔

غور کیجیے کہ صفا کی چوٹی سے جس وقت یکا و تنہا محمد رسول اللہ (ﷺ) نے اہل قریش کو توحید الٰہ اور ختم نبوت کی طرف بلایا تو اس وقت حقیقتاً آپؐ کل انسانیت سے مخاطب تھے۔ پھر ان میں سے جن لوگوں نے آپ کی آواز پر لبیک کہا، وہ آپؐ کے کہلائے اور آپؐ نے ان کی پرداخت مزید راحت و شفقت سے فرمائی، اس طرح آپؐ کے اسلوب دعوت میں درجہ بدرجہ فرق نمایاں ملتا ہے، اس حقیقت کا سراغ ہمیں بتوفیق الٰہی نص قرآنی ہی سے ملا، سورۂ توبہ کی آخری سے پہلی آیت ہے:

لقد جاء کم رسول من انفسکم عزیز علیہ
ماعنتم حریص علیکم بالمومنین رؤف رحیم

تمہارے پاس ایک ایسے پیغمبر تشریف لائے ہیں جو تمہاری جنس میں سے ہیں جن کو تمہاری مفرت کی بات نہایت گراں گذرتی ہے جو تمہاری منفعت کے بڑے خواہشمند رہتے ہیں۔ ایمانداروں کے ساتھ بڑے شفیق و مہربان ہیں (بیان القرآن)

غور سے دیکھیے تو اس آیت کے پہلے جزو عزیز علیہ میں قلب نبوی کے اس درجہ رحمت کا ذکر ہے جس کا تعلق امت دعوت سے ہے اور آیت پاک کے دوسرے جزو وبالمومنین رؤف (الخ) میں رحمت خاص کے اس درجہ کا بیان ہے جس کا تعلق صرف ''امت اجابت'' سے ہے، یعنی آپ کا دعوتی اسلوب ہے تو اسلوب رحمت ہی مگر امت دعوت کے معاملہ میں رحمت سوز و گداز اور بہی خواہی کی حرص کا رنگ لیے ہوئے ہے اور امت اجابت کے معاملہ میں رحمت نے رؤفیت اور رحیمیت کا دلبرانہ انداز اختیار کرلیا ہے۔

علاوہ ازیں اسی آیت پاک سے ایک اور نکتہ بھی ہاتھ آ گیا کہ پیغمبرانہ اسلوب دعوت قلبی اور فعلی اجزا سے مرکب ہے یا اسکے دو پہلو ہیں، ایک باطنی دوسرا ظاہری اور ان میں اولیت، اقدمیت اور اہمیت قلبی یا باطنی پہلو کو حاصل ہے، جس کی تائید مزید اس آیت سے ملتی ہے:

لولنت فظا غلیظ القلب لانفضوا من حولک

اگر آپ تند خو اور سخت دل ہوتے تو یہ لوگ آپ کے اطراف سے
چھٹ جاتے (آل عمران ۱۵۹)

یہاں پروانوں کے جمگھٹے کی علت شمع قلبی کے سوز و گداخت کو قرار دیا گیا ہے

تا نہ سوزد شمع کئے پروانہ شیدائی شود

غرض پیغمبرانہ اسلوب دعوت میں ضروری ہے کہ داعی کا قلب امت کے دکھ سے مغموم و محزون اور اس کی صلاح و فلاح کی کسک اور تڑپ سے بے چین ہو اور وہ اہل ملت کو کامرانی آخرت تک پہنچانے میں مضطرب ہو جائے اور خلوت، منزل سے نکل کر، اپنے ننگ و ناموس کی بازی لگا کر کوچہ و بازار ہی مسجد و کنشت میں) وہی فقہ میں اور کنج غریب اور کاشانہ امیر پر پہنچ کر حی علی الفلاح کی منادی کرنے لگ لبہ حضور اور کسی سے کسی اجر کا خیال اس کے واہمہ سے بھی دور ہو، پھر یہ بھی ضروری ہے کہ اس کی راتیں عبادت الٰہی کے ساتھ الحاح و زاری اور امت کی فلاح خواہی کی نامختتم دعاؤں کے لیے وقف رہیں۔ یہ طرز معاملہ امت دعوت کے ساتھ ہے۔

اس شبانہ روز جہد و کاوش سے جو لوگ پیغمبرانہ آواز پر لبیک کہیں اور داعی الی اللہ کی حلقہ بگوشی میں فخر محسوس کرنے لگیں تو اس ''امامت احابت'' کے ساتھ اسلوب رحمت کا اور زیادہ دلربایانہ ہوجانا لازمی ہے۔ ان کی تربیت کرکے انہیں کمالِ انسانیت تک پہنچانے کے لیے رؤفیت اور رحیمیت کا فیضان ناگزیر ہے۔ اسی لیے حق تعالیٰ نے فرمایا کہ بالمومنین روف رحیم یعنی اہل ایمان کیساتھ تو حضور اکرم ﷺ کی قلبی نوازشات اور کرم ارزانیاں بے حد و انتہا ہیں چاہتے ہیں کہ جس صبغۃ اللہ میں خود رنگے ہوئے ہیں ہر حلقہ بگوش کو اسی رنگ میں رنگ ڈالیں۔

شباب رنگیں ، بہار رنگیں وہ سر سے پا تک تمام رنگیں
تمام رنگیں بنے ہوئے ہیں ، تمام رنگیں بنا رہے ہیں

باطنی اسلوب کی اس مختصر توضیح کے بعد آیئے اب پیغمبرانہ اسلوب دعوت کے خارجی یا عملی پہلو کا قدرے تفصیلی جائزہ لیں کہ انسانی آنکھ کا پہلا واسطہ ظاہر ہی سے ہوتا

ہے اور اثر پذیری کا نقطہ آغاز پہلی نظر ہی ہوتی ہے۔

پیغمبر کے ظاہر اسلوب دعوت کی اولین شرط یہ ہے کہ داعی اپنی دعوت کا خود مرقع ہو، وہ جب کوئی بات کہے تو سننے والے اس کی آواز اس کے الفاظ اور اس کے لہجہ کی قوت کو اس کی ذات میں متشکل پا سکیں، داعی اپنے قول کا خود نفسی شاہد ہو۔

روئے و آواز پیمبر معجزہ ست

(رومیؒ)

چنانچہ یہ اسلوب بدرجہ اعجاز میں حضور اکرم ﷺ کی دعوت و تبلیغ میں نمایاں نظر آتا ہے۔ بقول عظیم و مقبول سیرت نگار حضرت علامہ سید سلیمان ندویؒ

''آپ نے صحابہ کو خدا کی یاد اور محبت کی نصیحت کی، صحابہ کی زندگی میں اس تلقین کا جو اثر نمایاں ہوا وہ تو الگ چیز ہے خود آپؐ کی زندگی کہاں تک اس کے مطابق تھی اس پر غور کرو، شب و روز میں کم کوئی ایسا لمحہ تھا جب آپ کا دل خدا کی یاد سے اور آپ کی زبان خدا کے ذکر سے غافل ہو۔ اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے، کھاتے پیتے، سوتے جاگے، پہنتے اوڑھتے ہر حالت میں اور ہر وقت خدا کا ذکر اور اس کی حمد زبانِ مبارک پر جاری رہتی تھی (۱) عام پیرووں کو تو پانچ وقتوں کی نماز کا حکم تھا مگر خود آپ آٹھ وقت نماز پڑھتے تھے۔ پنجوقتہ نماز کی فرضیت کے بعد تہجد کی نماز عام مسلمانوں سے معاف ہوگئی مگر آنحضرت ﷺ اس کو بھی تمام عمر ہر شب ادا فرماتے تھے، اور پھر کیسی نماز؟ کہ رات رات بھر کھڑے رہ جاتے، کھڑے کھڑے پائے مبارک میں ورم آجاتا، حضرت عائشہؓ عرض کرتیں۔ اللہ نے تو آپ کو ہر طرح معاف کردیا ہے۔ پھر اس قدر کیوں تکلیف اٹھاتے ہیں، فرماتے اے عائشہ! کیا میں خدا کا شکر گزار بندہ نہ بنوں...... (۲) آپؐ نے روزہ کا حکم دیا، عام مسلمانوں پر سال میں تیس دن کے روزے فرض ہیں، مگر خود آپؐ کی کیفیت کیا تھی؟ کوئی ہفتہ اور کوئی مہینہ روزوں سے خالی نہیں جاتا تھا، حضرت عائشہؓ کہتی ہیں جب آپؐ روزے رکھنے پر آتے تو معلوم ہوتا تھا کہ اب کبھی افطار نہ کریں گے (۳) آپؐ نے لوگوں کو زکوٰۃ و خیرات کا حکم دیا تو پہلے خود اس پر عمل کر کے دکھایا، حضرت خدیجہؓ کی شہادت

تم سن چکے ہو کہ انہوں نے کہا یارسول اللہ ﷺ آپ قرضداروں کا قرض ادا کرتے ہیں۔ غریبوں اور مصیبت زدوں کی مدد کرتے ہیں۔۔۔ حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ آپ تمام لوگوں میں سب سے زیادہ سخی تھے اور سب سے زیادہ سخاوت آپ رمضان المبارک میں فرماتے تھے، تمام عمر کسی سوال کے جواب میں نہیں کا لفظ نہیں فرمایا۔۔۔ خود فرمایا کرتے انما انا قاسم و خازن واللہ یعطی ۔۔ میں تو بانٹنے والے اور خزانچی کی حیثیت رکھتا ہوں، اصل دینے والا تو خدا ہے (۴)۔۔۔۔ آپؐ نے زہد وقناعت کی تعلیم دی لیکن اس راہ میں آپ کا طرز عمل کیا تھا؟ عرب کے گوشہ گوشہ سے جزیہ، خراج، عشر اور زکوٰۃ وصدقات کے خزانے لدے چلے آتے تھے، مگر امیر عربؐ کے گھر میں وہی فقر تھا، وہی فاقہ تھا، آنحضرت ﷺ کی وفات کے بعد حضرت عائشہؓ کہا کرتی تھیں کہ حضور اس دنیا سے تشریف لے گئے مگر دو وقت بھی سیر ہو کر آپ کو کھانا نصیب نہیں ہوا......(۵) آپؐ نے لوگوں کو ایثار کی تعلیم دی تو ساتھ ہی ان کے سامنے اپنا نمونہ بھی پیش کیا۔ حضرت فاطمہؓ سے جو آپ کو محبت تھی وہ ظاہر ہے مگر انہی حضرت فاطمہؓ کی عسرت اور تنگدستی کا یہ عالم تھا کہ چکی پیستے پیستے ہتھیلیاں گھس گئی تھیں اور مشک میں پانی بھر بھر کر لانے سے سینہ پر نیل کے داغ پڑ گئے تھے، ایک دن انہوں نے حاضر ہو کر پدر بزرگوار سے ایک خادمہ کی خواہش ظاہر کی، ارشاد ہوا، اے فاطمہ! اب تک صفہ کے غریبوں کو انتظام نہیں ہوا ہے تو تمہاری درخواست کیونکر قبول ہو، دوسرے روایت ہے کہ فرمایا بدر کے یتیم تم سے پہلے درخواست کر چکے (۶)۔ ''خدا پر اعتبار، توکل اور بھروسہ کی شان دیکھنا ہو تو محمد رسول اللہ ﷺ میں دیکھو۔۔۔ (معرکہ کارزار میں) ایسے موقع بھی آئے کہ مسلمانوں کے قدم اکھڑ گئے اور وہ پیچھے ہٹ گئے مگر خدا کی نصرت اور مدد پر اعتماد کامل رکھنے والا پہاڑ کی طرح اپنی جگہ قائم رہا۔۔۔ حنین کے میدان میں ایک دفعہ دس ہزار تیروں کا جب مینہ برسا تو تھوڑی دیر کے لیے مسلمان پیچھے ہٹ گئے مگر ذات اقدس اپنی جگہ پر تھی۔ ادھر سے تیروں کی بارش ہو رہی تھی، ادھر سے انا النبی لا کذب انا ابن عبدالمطلب کا نعرہ بلند تھا۔۔۔۔ (۷)۔ تم نے دشمنوں کو پیار کرنے کا وعظ سنا ہوگا لیکن اس کی عملی مثال نہیں دیکھی ہوگی۔ آؤ مدینہ

کی سرکار میں تم کو دکھاؤں ـــــ ابوسفیان کون جو، بدر، احد، خندق، وغیرہ لڑائیوں کا سرغنہ تھا ـــــ فتح مکہ سے پہلے حضرت عباسؓ کے ساتھ آپ کے سامنے آتا ہے تو گو اس کا ہر جرم اس کے قتل کا مشورہ دیتا ہے مگر رحمتِ عالمؐ کا عفوِ عام ابوسفیان سے کہتا ہے کہ ڈر کا مقام نہیں محمد رسول اللہ انتقام کے جذبے سے بالاتر ہیں۔۔ پھر حضورؐ نہ صرف اس کو معاف فرمادیتے ہیں بلکہ فرماتے ہیں من دخل دار ابی سفیان کان امنا (۸) سنہ ۸ ھ میں مسلمانوں کی فوج اسی طائف کا (جس کے شہریوں نے سب سے زیادہ حضور کو اذیت پہنچائی تھی) محاصرہ کرتی ہے۔۔۔ قلعہ فتح نہیں ہوتا بہت سے مسلمان شہید ہوتے ہیں۔ آپ واپسی کا ارادہ فرماتے ہیں۔ پر جوش مسلمان نہیں مانتے، طائف پر بد دعا کی درخواست کرتے ہیں۔ آپ ہاتھ اٹھاتے ہیں مگر کیا فرماتے ہیں۔ خداوند! طائف کو ہدایت کر اور اس کو اسلام کے آستانہ پر جھکا (۹)" غرض تفصیل کے لیے ایک دفتر چاہیے، حاصل عرض یہ ہے کہ داعی اسلام ﷺ کی ذات مبارک اپنی دعوت کا ایک کھلا عملی شاہکار تھی۔

پیغمبرانہ اسلوب دعوت میں نفسی شہادت یا داعی کی عملیت کے بعد دوسرا جزو دعوت کی پیش کش کا نہج ہے، آنحضرت ﷺ کی سیرت پاک سے جو روشنی ملتی ہے، وہ یہ ہے کہ مجادلانہ و مناظرانہ پیرائے سے بچتے ہوئے فطرت بشری کو مخاطب بنایا جائے۔ دماغ سے زیادہ دل سے دل پر زد لگائی جائے اور اسکے لیے خطیبانہ زور اور نفسیات اجتماعی سے بھی کام لیا جائے۔ حضور کے تمام خطبات سے یہی کچھ سمجھ میں آتا ہے مثال کے لیے کوہ صفا کے لیے پہلے اعلان حق اور حجۃ الوداع کے آخری اعلان منشور کو یہاں پیش کیا جاتا ہے۔ اس کے اسلوب کو خاص طور پر دیکھنے کی ضرورت ہے۔

صفا کی منادی

فاصداع بما تومروا عرض عن المشرکین (الحجر ۹۴) آپ کو جو حکم خدا کی طرف سے ملا ہے وہ لوگوں کو سنا دیجیے اور مشرکوں کا ذرا خیال نہ کیجیے) کا حکم پا کر جب ہادی اعظم ﷺ کوہ صفا پر چڑھے ہیں تو پہلے آپ نے یہ صدا لگائی، یا صباحاہ یعنی خطرہ خطرہ !!! اس آواز کا سننا تھا کہ سارے قبائل کے لوگ دامن کوہ میں آ

پہنچے۔ تب آپ نے فرمایا اور استفہامیہ پیرایہ میں خطاب کا آغاز کیا کہ:
اگر میں تم سے یہ کہوں کہ پہاڑ کے عقب سے ایک لشکر آرہا ہے تو تم کو یقین آئے گا؟۔۔۔ سب نے کہا ہاں کیونکہ تم کو ہمیشہ سے ہم نے سچ بولتے دیکھا ہے"۔ آپ نے فرمایا" تو میں یہ کہتا ہوں کہ اگر تم ایمان نہ لاؤ گے تو تم پر عذاب شدید نازل ہوگا" (۱۰)۔

مولانا ابوالحسن علی ندویؒ نے حضورﷺ کے اس پر حکمت خطاب کے متعلق لکھا ہے کہ:

"واقعہ یہ ہے کہ اس سے مختصر اور آسان راستہ اور اس سے زیادہ قابل فہم اور واضح پیرایہ بیان کوئی اور نہیں ہوسکتا تھا" (۱۱)۔

اب آخری خطبہ حجۃ الوداع کے چند اقتباسات سنیے۔ حمد باری تعالیٰ کے بعد آپ نے ارشاد فرمایا:

"لوگو! میری باتوں کو توجہ سے سنو! اس لیے کہ شاید اس کے بعد پھر اس جگہ کبھی تم سے ملاقات نہ کرسکوں، اے لوگو! تمہاری جانیں اور تمہارے مال تم پر حرام ہیں اور اسی طرح حرام ہیں جس طرح آج کا دن حرام ہے۔ آج کے دن ہر سود ختم کردیا گیا مگر اصل مال وہ تمہارا حق ہے حلال ہے، اور سب سے پہلے اپنے خاندان کا سود، عباس بن عبدالمطلب کا سود باطل قرار دیتا ہوں۔ ہر خون ناحق جو جاہلیت میں بہایا گیا، باطل کردیا گیا، اور پہلا خون جسکو میں ختم کرتا ہوں، وہ ابن ربیعہ بن حارث بن عبدالمطلب کا خون ناحق ہے جب وہ ایام شیر خوارگی میں بنی لیث تھے اور ان کو بنی ہذیل نے قتل کردیا تھا۔

اے لوگو! شیطان اب اس سے مایوس ہوگیا کہ وہ تمہاری زمین میں پھر کبھی پوجا جائے لیکن اور کاموں میں لوگ اسکی اطاعت کریں گے اے لوگو! زمانہ گھوم کو اپنے مرکز پر آگیا ہے اور اسی مرکز پر آگیا ہے جس دن اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا تھا۔۔۔" (۱۲)۔

خطاب کے مندرجہ بالا مختصر اقتباسات سے اندازہ ہوا ہوگا کہ دعوت پیش کرنے کا پیغمبرانہ اسلوب کیا تھا۔

اسی ضمن میں ایک اہم بات یہ بھی دیکھنی ہے کہ گو داعی اسلام کو اپنے دین کی حقانیت کا اظہار ناگزیر ہے مگر اس اظہار حق میں باطل مذاہب کی تردید میں اس کو کیا رویہ اختیار کرنا چاہیے بالفاظ دیگر اس میں پیغمبرانہ اسلوب کیا رہا ہے؟۔۔۔ سیرت ابن ہشام جلد دوم (۱۳) میں یہ روایت موجود ہے کہ ایک مرتبہ حضور انور ﷺ بنفس نفیس یہودیوں کی ایک عبادت گاہ میں تشریف لے گئے اور ان پر اللہ کی دعوت پیش کی تو نعمان بن عمرو اور حارث بن زید نے آپ سے پوچھا کہ آپ خود کس دین کے پیرو ہیں؟۔۔۔ آپ نے ارشاد فرمایا:

علی ملة ابراھیم و دینه

یعنی حضرت ابراہیم کے مشرب اور دین پر۔۔۔ اس پر ان دونوں نے کہا کہ ابراہیم تو یہودی تھے۔ حضورؐ نے جواباً ارشاد فرمایا

فھلم الی التوراة فھی بیننا و بینکم

اچھا تو توریت لاؤ وہ ہمارے تمہارے درمیان فیصلہ کرے گی۔

یہ جواب مبارک ان کے لیے مسکت بھی تھا اور دل میں اتر جانے والا بھی تھا، یہ اور بات ہے ہٹ دھرمی کی وجہ سے انہوں نے اس پیش کش کی قدر نہ کی، مگر قرآن کی آیت نمبر 23 سورہ آل عمران کے ان الفاظ سے کہ ثم یتولی فریق منھم (ایک جماعت نے روگردانی اختیار کی) یہ پتہ چلتا ہے کہ سامعین میں سے ایک جماعت تو قائل ہوگئی اور حضور اقدس ﷺ کا اسلوب دعوت اثر انداز ہوکر رہا۔۔۔ اس واقعہ سے ہمیں سبق ملا کہ اہل کتاب میں تبلیغ ان کے مذہب و کتاب کا احترام ملحوظ رکھتے ہوئے ہوئے خود ان کی کتابوں کے حوالے سے ہونی چاہیے یہی سب سے قریبی، محفوظ اور اثر آفرین طرزِ دعوت ہے جس میں معاندانہ جذبات کی آگ کو بجھا کر ہمدردانہ غور و فکر کی ذہنی فضا پیدا ہوسکتی ہے۔

اور دیکھیے داعی اسلام خواہ خود مناظرہ و مجادلہ سے محترز رہے مگر کبھی ایسے مواقع آجاتے ہیں کہ خواہی نہ خواہی اس کو مناظرہ پر مجبور ہونا پڑ جاتا ہے۔۔ یہ موقف بہت

نازک ہے کیونکہ اس میں مقابلہ اور ہار جیت کے جذبات برافروختہ ہوجاتے ہیں۔ مگر قربان جائیے ہادی اعظم ﷺ کے اور آپ ﷺ کے اسوہ کامل کے کہ یہاں بھی ہم کو آپ ﷺ کے مؤثر اسلوب کا نقش تاریخ کے صفحات پر ثبت مل جاتا ہے۔

دیکھیے ۹ ھ ہے، نجران کے ایک وفد خاتم الانبیاء ﷺ کی خدمت آتا ہے یہ لوگ مذھبا نصاریٰ ہیں۔ مسجد نبوی میں عصر کی جماعت ہوچکی ہے، نصاریٰ کا وقت نماز آیا تو انہوں نے عین مسجد نبوی میں اپنی نماز پڑھنی چاہی صحابہؓ نے روکا مگر رحمت عالم ﷺ نے فرمایا ''پڑھنے دو'' وفد نجران نے مشرق کی سمت لے کر نماز ادا کی اور حضور کی طرف متوجہ ہوئے آپ نے اس اکرام ضیف کے بعد ان پر اسلام پیش کیا۔ انہوں نے کہا کہ ہم تو پہلے ہی سے مسلمان ہیں۔ حضورؐ نے فرمایا ''مگر تم لوگ تو حضرت عیسیٰ کو خدا کا بیٹا مانتے ہو صلیب کو پوجتے ہو اور خنزیر کھاتے ہو'' اس پر اہل وفد بولے۔ ''آپ حضرت مسیح کو اللہ کا بندہ بتاتے ہیں؟ کیا آپ نے مسیح جیسا کسی کو دیکھا ہے یا سنا ہے؟۔۔ یہاں دعوت کی پیش کش نے مناظرہ کا رنگ اختیار کرلیا۔ اور سوال و جواب ہونے لگا۔

(آنحضرت) تم کو خوب معلوم ہے کہ بیٹا باپ کے مشابہ ہوتا ہے۔

(اہل وفد) بے شک ایسا ہی ہوتا ہے

(آنحضرت) کیا تم کو معلوم نہیں ہمارا پروردگار حی لایموت (زندہ و غیر فانی) ہے اور ان عیسیٰ یاتی علیہ الفناء (اور عیسیٰ پر موت اور فنا آنے والی ہے) تم کو معلوم ہے کہ ہمارا پروردگار ہر چیز کو قائم رکھنے والا تمام عالم کا محافظ اور سب کا رازق ہے۔ کیا حضرت عیسیٰ بھی ان میں سے کسی کے محافظ ہیں؟

(اہل وفد)۔۔۔۔ نہیں!

(آنحضرت) تم کو خوب معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ کو رحم مادر میں جس طرح چاہا بنایا۔ اور تم کو یہ بھی معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ نہ کھاتا ہے نہ پیتا اور نہ اسکو بول و براز کی حاجت لاحق ہوتی ہے۔

(اہل وفد)۔۔۔۔ بے شک!

(آنحضرت) تم کو خوب معلوم ہے کہ حضرت مریم اور عورتوں کی طرح عیسیٰ علیہ السلام کو حمل میں لیے رہیں اور مریم صدیقہ سے عیسیٰ اسی طرح متولد ہوئے جیسے اور بچے عورتوں سے ولادت پاتے ہیں اور پھر بچوں ہی کی طرح ان کو غذا بھی دی گئی وہ کھاتے پیتے بھی تھے اور بول و براز بھی کرتے تھے۔

(اہل وفد) بے شک ایسا ہی تھا

(آنحضرت) پھر وہ خدا کیسے ہوئے؟

اس پر اہل وفد لاجواب رہ گئے۔

اس مکالمہ میں دیکھنے کی بات یہ ہے کہ ہمارے آقائے نامدار ﷺ کا مناظرانہ طرز بھی کس قدر غیر جارحانہ بلکہ مشفقانہ اور ترحم سے بھرپور ہے، اسی لیے ہم نے آپ کے اسلوبِ دعوت کو ''اسلوبِ رحمت'' سے تعبیر کیا ہے۔

اس ''اسلوب رحمت'' کی قولی تاکید ہم کو اس وقت ملتی ہے جب تاجدار مدینہ ﷺ حضرت معاذ ابن جبلؓ اور ابو موسیٰ اشعریؓ کو تبلیغ اسلام پر روانہ فرما رہے ہیں۔ ان مبلغین اسلام سے آپ نے تاکیداً فرمایا: بشروا ولا تنفروو لا یسّروو لا تعسّروا

یعنی بشارتی نہج اور سہولتی طرز ملحوظ رکھو، وہ اسلوب نہ اختیار کرو جس سے مخاطب میں نفرت کے جذبات ابھریں یا وہ اسلام میں تنگی محسوس کرنے لگے۔

آنحضرت ﷺ کا مذکورہ صدر اسلوب آپ کے ان نامہ ہائے مبارکہ سے بھی مترشح ہے جو آپ نے مختلف سلاطین کے نام لکھوائے ہیں۔ ان کو پڑھیے تو ان میں وہی دلسوزی، وہی رافت، وہی رحمت، راست قلب انسانی سے تخاطب اور مخاطب کی دلجوئی کے ساتھ دل شوئی ملتی ہے۔ نمونتہً ہم صرف ایک والا نامہ جس کا مخاطب ایک قدیم ترین سلطنتِ حبشہ کا والی نجاشی ہے پیش کرتے ہیں۔

''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ محمد کی طرف سے جو اللہ کا رسول ہے یہ خط نجاشی کے نام ہے جو حبشہ کا رئیسِ اعظم ہے۔ سلام ہے اس شخص پر جو ہدایت کا پیرو ہو۔ امابعد میں حمد بیان کرتا ہوں تم سے اس اللہ کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں جو بادشاہ ہے قدوس ہے سلام ہے۔

مؤمن اور مہیمن ہے اور گواہی دیتا ہوں اس بات کی کہ عیسیٰ ابن مریم اللہ کی روح اور اس کا کلمہ ہیں جس کو اس نے پاک نفس و پاکباز مریم البتول میں پھونکا تھا۔ پس اس کی روح اور اسکی نفخ سے عیسیٰ ان کے بطن میں قرار پائے جیسے اس نے آدم کو اپنے ہاتھ سے بنایا تھا، میں تم کو دعوت دیتا ہوں ایک اللہ پر ایمان لانے کی جس کا کوئی شریک نہیں اور اس کی اطاعت، موالات کی اور یہ کہ تم میری اتباع کرو، اور جو کچھ میرے اوپر وحی آئی ہے اسپر ایمان لاؤ۔ پس بے شک میں اللہ کا رسول ہوں اور میں تم کو اور تمہارے لشکروں کو اللہ عزوجل کی طرف بلاتا ہوں۔ میں نے اپنا پیغام کہہ دیا اور نصیحت پوری کردی۔ پس یہ نصیحت قبول کرو۔ سلام ہو اس پر جو ہدایت قبول کرے۔

سبحان اللہ مکتوب کیا ہے۔ ہدایت و اسلوب ہدایت اور حقیقت عزیز علیہ ماعنتم حریص علیکم کا آئینہ بے غبار

نبینا الامر الناھی فلا احد
ابرّ فی قول لا منہ ولا نعم

(بوصیریؒ)

(یعنی ہمارے نبیؐ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنے والے ہیں اور کوئی دوسرا نہیں جو ہاں یا نہیں کہنے میں آپ سے زیادہ سچا ہوا)

پیغمبرانہ اسلوب دعوت کی ایک اور خصوصیت کا ذکر کر کے بات ختم کردوں وہ یہ کہ حضور ﷺ ہر موقع سے دعوت دین کا فائدہ اٹھا لیا کرتے تھے۔ گویا آپ کے تمام انفاس مبارکہ ذکر الٰہی کے ساتھ ساتھ تذکیر دینی کے لیے وقف تھے، اس کی بہت سی مثالوں میں سے صرف ایک بطور نمونہ پیش ہے۔

الوفاء الوفاء البدایہ النہایہ میں ہے کہ دو عجمی سفیر حضور اقدسؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے ان کی ڈاڑھیاں منڈھی ہوئی اور مونچھیں بڑی بڑی تھیں آپ نے ان سے دریافت فرمایا کہ تم نے چہرے کی یہ ہیئت کیوں بنالی ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ ہمارے ربّ بمعنی آقا یعنی بادشاہ کا یہی حکم ہے، حضور اکرم ﷺ نے فرمایا ''میرے رب

نے تو مجھے یہ حکم دیا ہے کہ ڈاڑھی کو بڑھاؤں اور مونچھوں کو ترشواؤں۔۔۔"

بظاہر ایک بات ہے جو حضور نے فرمائی ہے مگر ایک گہری حقیقت کی طرف توجہ کی انعطاف کا یہ ایک بلیغ اور دل نشیں اسلوب ہے یہاں حضور کے مخاطب سفراء ہیں اور سفیر اسی کو بنایا جاتا ہے جو نہایت ذہین، سخن فہم اور نکتہ رس ہو اور اشارہ کنایہ کی گہرائی تک پہنچ سکتا ہو۔ حضورؐ نے ان دو سفیروں کو ایک اشارہ بلیغ سے یہ دعوت فکر دی کہ ایک آقا تمہارا ہے جس کی آقائیت سراسر مجازی اور اتفاقِ بخت کا نتیجہ ہے اور ایک آقا اور مربی میرا ہے جس کی مالکیت و ربوبیت ذاتی و حقیقی ہے جب کسی کو آقا بنانا ہو تو خود ہی سوچو کہ کسی اپنے ہی طرح کے فانی انسان کو بنانا عقلمندی کی نشانی ہے یا کسی ایسی ذات کو جس کی آقائیت ذاتی، حقیقی اور لاشریک ہو! یہ ہے پیمبرانہ اسلوب دعوت، نفسیات بشری کی کتنی رعائتیں لیے ہوئے اور اثر و تاثیر کے کتنے سامان کیے ہوئے۔

خیالِ نقش تو در کارگاہ دیدہ کشیدم
بصورت تو نگارے ندیدم و نشنیدم

(حافظؒ)

فصلی اللہ علی النبی الامی الکریم و سلم تسلیما کثیرا

حواشی

۱ تا ۲۔ خطبات مدراس۔ خطبہ "عملیت"

۳ تا ۷۔ خطبات مدراس، خطبہ عملیت

۸، ۹۔ دیکھو نبی رحمت از مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ، جلد اوّل، صفحہ ۱۲۱

۱۰۔ صحیح بخاری

۱۱۔ نبی رحمت بحوالہ سابق

۱۲۔ الکامل ابن اثیر جلد دوم

۱۳۔ صفحہ ۲۷۹ (ترجمہ شائع شدہ دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن)

۱۴۔ سیرۃ المصطفیٰ مولف مولانا ادریس کاندھلویؒ، ج ۳، ۱۲۰ تا ۱۲۳ بحوالہ تفسیر درمنشور

حکمتِ رُوحانیاں

حضرت مولانا ڈاکٹر غلام محمد قدس سرہٗ العزیز

خلیفہ مجاز حضرت علامہ سید سلیمان ندوی قدس سرہٗ العزیز

مصنف تذکرہ سلیمان، حیات اشرف، حیاتِ بہادر یار جنگ

ترتیب و تدوین:

محمد طارق صدیق

پورب اکادمی